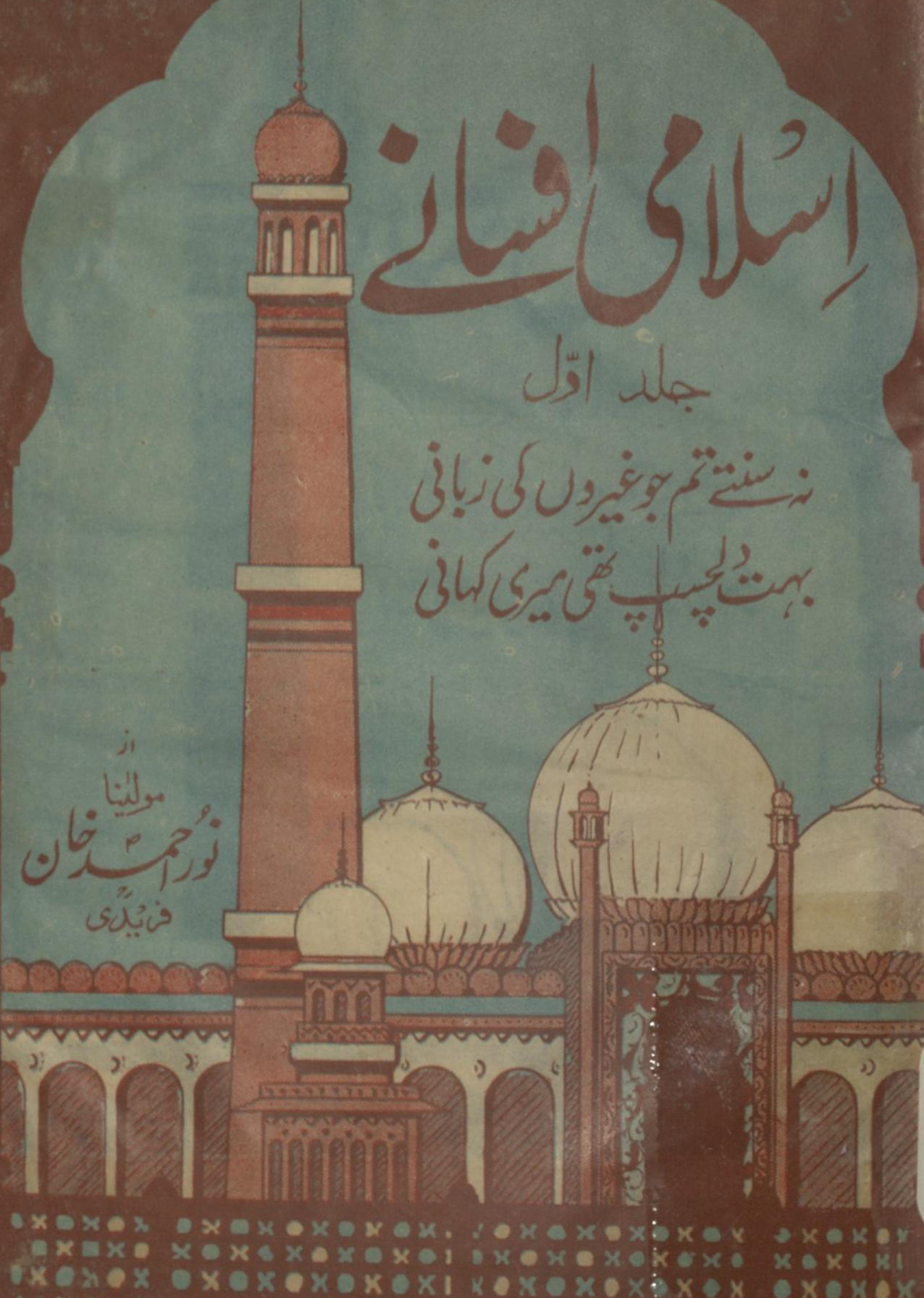
اسلامی افسانے

جلد اوّل

نہ سنتے تم جو غیروں کی زبانی
بہت دلچسپ تھی میری کہانی

از
مولینا
نور احمد خان
فریدی



ناشر:- قصر الادب جگو والہ بھراں ضلع ملتان

(منظور شدہ محکمہ تعلیم پنجاب، بموجب سرکلر نمبر ۱۶۸۷۱/۶۰۵۴ بم جی)

اسلامی افسانے

داستان عہد گل را از نظیری مے شنو
عندلیب آشفتہ تر گفتہ است ایں افسانہ را

جلد اوّل

از

مولانا نور احمد خان فریدی

قصر الادب، رائیٹرز کالونی، ملتان

قسم اوّل [illegible] روپے

قسم دوم [illegible] روپے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

انتساب

علامہ محمدؒ طاہر فاروقی کی کتاب "سیرتِ اقبال" کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ حکیم الامت علامہ محمدؒ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اسلامی تاریخ کو افسانوی رنگ میں دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ اِس جذبہ نے مجھے اِس فن کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ میں نے تاریخ کی "شراب" کو پہلی بار افسانے کے "رنگین جام" میں پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ اگر علامہ آج زندہ ہوتے تو یہ گلدستہ اُن کی خدمت میں نذر کرتا۔ اب اُن کے نامِ نامی و اسمِ گرامی سے منسوب کرتا ہوں ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم!
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

ملتان
یکم اپریل ۱۹۷۰ء

خاکسار
نُور احمدؒ خاں فریدی

"افسانوں کے نفسیاتی پہلو کے لطف کا میں ضرور قائل ہوں لیکن اگر اُن کی جگہ ایسی شے پیش کی جائے جو افسانے کا افسانہ ہو اور سبق کا سبق تو بہتر ہو گا۔ اسلام کے اولوالعزم فرزند ایسے ایسے کارنامے انجام دے چکے ہیں کہ اُن کا تذکرہ بہتر سے بہتر افسانے سے زیادہ دلچسپ ہے! میری مدّت سے خواہش ہے کہ کوئی ادیب یا مؤرخ اس سلسلہ کو شروع کرے۔ تاریخ میں اس کے لئے کافی مواد موجود ہے۔ صوفیائے اسلام، فلسفیانِ اسلام، علمائے اسلام مجاہدینِ اسلام، شعرائے اسلام وغیرہ ہر عنوان پر ایک دلچسپ تذکرہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔"

محمد اقبالؔ

"سیرت اقبال" صفحہ ۶۳

تعارف

مولانا نُور احمد خاں فریدی برِّ صغیر پاک و ہند کے اُن وسیع المطالعہ محقّقین میں سے ہیں جو علم و تحقیق کی مشعل لے کر تاریخ کی پُر پیچ وادیوں کو اُجاگر کرتے رہتے ہیں۔ ان کا مطالعہ، تاریخ کی وسعت اور تحقیق و تدقیق کی گہرائی ہمہ گیری اور گھمبیرتا لیے ہوئے ہے۔

مولانا ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء کو ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔ ان کا گاؤں ان کے نام کی نسبت سے "نُور محل" سے موسوم ہو کر عالمگیر شہرت کا حامل بن چکا ہے۔ آپ کے والد ماجد الحاج مولانا امام بخش خاں بلوچ خاندان کے ممتاز رکن ہیں۔ اگرچہ ان کی عمر سو برس سے تجاوز کر چکی ہے لیکن عمر کے اعتبار سے صحت اتنی اچھی ہے کہ صوم صلوٰۃ بلکہ نوافل و اوراد تک باقاعدگی سے ادا کر رہے ہیں۔

مولانا نے قرآن ایک بنگالی عالم سے پڑھا اور ابتدائی مرّوجہ تعلیم زکریا ہائی سکول بمبئی سے حاصل کی۔ دینی تعلیم مولانا اللہ وسایا خاں صاحب کلاچی اور مولانا محمد افضل خاں صاحب گرمانی سے پائی۔ انٹرنیس اور السنہ شرقیہ کے امتحانات پاس کر کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں آپ کا پہلا مضمون "میرا خواب"

نخلستان (ملتان) میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ اس قدر مقبول ہوا کہ پنجاب کے اکثر جرائد نے مضامین کے لیے فرمائشی خطوط بھیجے۔ ۱۹۴۰ء تک مولانا ملتان کے نزدیکی مدارس میں تعینات رہے۔ اس دوران انہوں نے "ابنِ زبیرؓ" "حجاج بن یوسف" اور "سرزمینِ ملتان" کے نام سے تین کتابیں شائع کیں۔ عرصہ تک اخبار "صداقت" بھی ان کی اِدارت میں نکلتا رہا۔ "الفرید" اور "گنج شکر" کے نام سے دو ماہنامے بھی جاری کئے۔ اِن ایام میں آپ کے مضامین "صبحِ امید" "عندلیب (بمبئی)، اور نیرنگ خیال، عالمگیر، نسوانی دُنیا، سدا بہار، خیام، اداکار (لاہور)، اُردُو (دہلی)، العزیز اور ستلج (بہاولپور) میں باالاستقلال چھپا کرتے تھے۔ "دیوانِ فریدیؒ" کے ترجمہ میں بھی آپ نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

مولانا کی تخلیقات بالعموم تاریخی اور تنقیدی ہوا کرتی تھیں۔ ان کی عبارت میں اگرچہ متانت اور سنجیدگی کا عنصر غالب تھا، تاہم کہیں کہیں اندازِ بیان اس قدر مہیب ہو جاتا جیسے جہنّم کا فرشتہ اہلِ دوزخ سے مخاطب ہو۔ "مشاہیر ادب کی لغزشیں" میں انہوں نے ایسے ایسے قادر الکلام ادبا کی گرفت کی جن کا سکّہ دُنیا مانتی ہے۔ "ڈراما" شاہجہان پر اِک نظر" میں صاحبِ مضمون پر ایسے برسے کہ اُسے جواب دینے کی ہمّت نہ ہوئی۔

اسلامی افسانے

۱۹۴۱ء میں ان کے ذہنی رجحانات میں ایک عجیب و غریب تبدیلی رونما ہوئی

اور وہ تحقیق و تجسس کے بے آب و گیاہ اور لق و دق صحراؤں سے نکل کر افسانے کی دلفریب و پُر کیف وادیوں میں گامزن نظر آنے لگے۔ فکر کی ان تبدیلی اور رجحانات کے اس موڑ کی وجہ جیسا کہ مولانا نے خود اپنے "پیش لفظ" میں بیان کیا ہے، حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم کا وہ بیان ہے جس نے انہیں افسانوی ادب کی طرف راغب اور متوجہ کیا۔ مجھے تو اسلامی افسانوں کے مطالعے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کا صحیح مقام یہی تھا۔ اگر وہ کچھ عرصہ اور بھی تحقیق و تدقیق کے سمندر میں غوطہ زنی کرتے رہتے تو بھی ان کو ایک نہ ایک دن انہی راستوں پر گامزن ہو کر اسی منزل کی طرف اپنے قدموں کو بڑھانا تھا۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ وہ جلد ہی اپنے ایک قابلِ قدر جوہر سے روشناس ہو گئے۔ اسلامی افسانوں کے سرِ ورق پر ایک شعر مرقوم ہے ؎

نہ سُنتے تم جو غیروں کی زبانی ٭ بہت دلچسپ تھی میری کہانی

اس شعر سے بھی مولانا کے اسی جذبہ کی جھلک نظر آتی ہے۔ یعنی آج تک آپ نے اپنی کہانی غیروں کی زبانی سُنی ہے۔ اب اپنوں کی زبانی اپنی کہانی سُنیئے۔

"اسلامی افسانے" کی اس وقت تک صرف دو جلدیں شائع ہوئی ہیں، اور اس وقت دونوں جلدیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان دونوں جلدوں میں اسلام کے علماء، فضلاء، شعراء اور مجاہدین کے کارنامے صفحۂ قرطاس پر بکھرے پڑے ہیں جنہیں مولانا نے اپنی خوبصورت اور پیاری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔ دونوں کتابوں

کے مطالعہ سے ہم پر یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا نے اسلامی افسانوں کو اپنا موضوع بنانے سے پہلے افسانے کی تیکنیک اور تنوّع کا اچھی طرح مطالعہ کر لیا ہوگا، کیونکہ ان کے افسانوں میں پلاٹ، کرداروں کا انتخاب منظر نگاری، مکالمے اور دوسری تمام چیزیں جو افسانے کے لوازمات کی حیثیت رکھتی ہیں، اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتی ہیں۔ شیبۃ الحمد، نورالدین کا نمراب، اورنگ زیب کی اصلی تصویر اور زنجیرِ عدل بلند پایہ افسانے ہیں ان افسانوں کے مطالعہ سے بہت سی ایسی باتوں پر سے نقاب کشائی ہوتی ہے جو آج تک ہمارے ذہنوں میں کسی اور ہی ترتیب اور کسی اور ہی رنگ میں منقّش تھیں۔ اسلامی افسانے پڑھتے وقت ہم یہ محسوس کرتے ہیں جیسے اسلام کے یہ کردار جنہوں نے اپنے دور میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے ہماری نظروں کے سامنے زندہ چل پھر رہے ہیں۔

"شیبۃ الحمد" سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدّ امجد حضرت عبدالمطلب کی ولادت کی داستان ہے۔ جسے نہایت ہی مؤثر اور حسین و جمیل انداز میں پیش کیا گیا ہے مولانا نے سیّدنا عبدالمطلب کے بچپن کے ایک ایک گوشے کو ہماری نظروں میں لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ افسانہ کافی طویل ہے لیکن یہ طوالت اسکی دلچسپی میں حارج نہیں ہوتی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں، ہمارا تجسّس اور شوق تجاوز کرتا جاتا ہے۔ اور جب ہم افسانہ ختم کرتے ہیں تو ہماری آنکھوں

میں آنسو اور ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اشک و تبسّم کا یہ حسین امتزاج ہمارے قلب و ذہن پر ایک عجیب روحانی کیف و مسّرت بن کر چھا جاتا ہے۔

"نورالدین کا خواب" اپنے تأثر اور مزاج کے اعتبار سے افسانوی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے، یہ داستان دو افرنگیوں اور نورالدین کے اردگرد گھومتی ہے اس لیے پڑھ کر ہر مسلمان کے دل میں قومی عصبیت اور دینی حمیت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو قومی زندگی کے تحفّظ اور بقا کے لیے ضروری ہے۔ "اسلامی افسانے" کے تمام افسانے ہمارے دلوں میں کھوئی ہوئی قوتوں اور سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتے ہیں ۔۔ ان کے پڑھنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ماضی کیا تھا، حال کیا ہے، اور مستقبل کیا ہوگا۔ یہ افسانے ہمیں خوابِ غفلت سے چونکاتے ہیں اور ہمارے اندر اپنے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کرنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

"اورنگ زیب عالمگیر کی اصلی تصویر" سے ہمیں معلوم ہوتا ہے، کہ عالمگیر دراصل وہ نہیں تھا جو ہندو اور انگریز مؤرخین کے تعصّب نے ظاہر کیا ہے۔ وہ ایک نیک دل، منصف مزاج، خدا پر بھروسہ رکھنے والا اور صحیح معنوں میں ایک مسلمان بادشاہ تھا۔ اُسے دُنیا کی نگاہوں سے گرانے کے لئے عیسائیت اور ہندوازم کی یہ ایک بہت بڑی چال تھی۔

اسلامی افسانے اپنی معنوی اور صوری حیثیتوں سے ایک بلند پایہ کتاب ہے اور ایسی کتابوں کا ہر مسلمان گھرانے میں ہونا لازمی ہے۔ ان کتابوں سے بچے بوڑھے، نوجوان سبھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ وقت کی یہ ایک بڑی ضرورت ہے کہ ہم اپنے ماضی کو یاد رکھیں اور اسلاف کے کارناموں سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کریں۔ اسلامی افسانے ماضی کی داستانیں یاد دلا کر ہمیں ایک خوش آئند مستقبل کا پتہ دیتے ہیں۔

ہمیں یہ جان کر مسرت ہوئی ہے کہ مکتبہ قصر الادب اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن طبع کرا رہا ہے۔ چونکہ محکمہ تعلیم لاہور ریجن نے اسے کالجوں۔ ہائی سکولوں اور مڈل سکولوں کی لائبریریوں کے لئے منظور کر رکھا ہے اس لئے اکثر و بیشتر ہائی سکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان نے طلبہ کے زائد مطالعہ کی غرض سے اس کے پچاس پچاس سیٹ تک خرید کئے ہیں۔ ہفتہ میں ایک پیریڈ اس کتاب کے لئے وقف کیا گیا۔ جس میں طلبہ اپنے اُستاد کی نگرانی میں اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جہاں جہاں ان کتابوں کا بالاستقلال مطالعہ کرایا گیا، وہاں طلبا پر ان کا بڑا خوشگوار اثر پڑا ہے۔ ہماری مخلصانہ رائے ہے کہ محکمہ اس کتاب کا مطالعہ ہر طالب علم کے لئے لازمی قرار دے، تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔

آزاد شیرازی

سخن ہائے گفتنی

سُن کر مرا "فسانہ" انہیں لُطف آگیا
سُنتا ہوں اب کہ روز طلب قصّہ خواں کی ہے

مجھے نہ ڈرامہ نگاری کا ذوق ہے اور نہ افسانہ نویسی کا شوق۔ میری طبیعت کا رجحان تنقیدی مقالات کی طرف زیادہ ہے۔ اس لیے میں بالعموم ٹھوس علمی مضامین ہی لکھا کرتا ہوں۔ علّامہ مرحوم کے ارشادِ گرامی نے مجھے "اسلامی افسانے" لکھنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ یہ گل دستہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ احتیاط یہ رہی ہے کہ "افسانویت" حقیقت پر غالب نہ آنے پائے۔ اس میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کا فیصلہ ناظرین کرام پر چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ ؎

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید!

یہ میری پہلی کوشش ہے، اگر اربابِ ذوق نے اسے پسند کیا، تو تاریخ اسلام کے ایسے تمام قابلِ فخر کارناموں کو جن سے ہمارے اسلاف کی سیرت اجاگر ہو سکتی ہے، افسانوی رنگ میں پیش کیا جائے گا۔

سردست یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سلسلہ کتنے نمبروں پر جا کر ختم ہو
جدید تیکنیک کے دلدادگان شاید اس مجموعہ کو پسند نہ کریں۔ کیونکہ
ان میں ان کی "ضیافتِ طبع" کا کوئی سامان نہیں۔ یہ سلسلہ صرف اُن
حضرات کے لئے شروع کیا جا رہا ہے، جو "فنِ تاریخ" سے وابستگی رکھتے
ہیں اور افسانے کے پودے کو تاریخ کے سائے میں سرسبز دیکھنے کے
خواہش مند ہیں۔ "الف لیلیٰ" اور "فسانۂ عجائب" کے قارئین کو معلوم
رہے کہ یہ افسانے، جن کے پیش کرنے کی عزت حاصل کی جا رہی ہے
طبع زاد قصّے کہانیاں نہیں ہیں، بلکہ اسلامی دُنیا کے ایسے سُنہری
کارنامے ہیں، جن پر مسلمان جتنا بھی فخر کریں بجا ہے۔ یہ واقعات
اب تک تاریخیں اپنی آغوش میں لئے پڑی تھیں۔ میں نے "تخیّل" اور
"قیاس" کی مدد سے وہ ماحول کھڑا کر دیا ہے جو مؤرخین نے "عدمِ گنجائش"
اور "مصلحتِ وقت" کے تقاضا سے نظر انداز کر دیا تھا۔ دُوسرے
معنوں میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ افسانے دراصل وہ
"حقائق" ہیں، جو تاریخ کی کروٹوں میں دبے پڑے تھے۔ انہیں میں
نے ناظرین کرام کے سامنے توضیحی صورت میں پیش کر دیا ہے۔

پہلا افسانہ "لعل کی چوری" ہے۔ اِس سے پتہ چلتا ہے، کہ
ہمارے اسلاف ہماری طرح "اسبابِ زیست" مہیا کرنے میں اِس

قدر پریشان نہ تھے۔ وہ لوگ سادہ زندگی بسر کرنے کے باوجود بعض شب چراغ سے کھیلا کرتے تھے۔

چاکر اعظم، پان کی گلوری، زنجیرِ عدل، توزک جہانگیری کا ایک ورق، اور کوٹ نورنگ کی تباہی، سے ظاہر ہوتا ہے، کہ "عہدِ وسطیٰ" میں انصاف آج کی طرح مہنگا نہیں تھا۔۔۔ فریادی برسرِ دربار اپنے بادشاہ سے دادخواہ ہو سکتا تھا۔ ملزم خواہ ولی عہدِ سلطنت ہوتا یا کوئی امیرِ کبیر، اُسے فریادی کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہونا پڑتا۔ اور جو سزا اُسے ملتی وہ عام ملزموں سے زیادہ سنگین ہوتی بادشاہ اپنی رعایا کو اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ اس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہ ہوتی تھی۔ اُن کے عدل و انصاف کا آفتاب عالم تاب بلا امتیازِ رنگ و ملّت ہر کہ ومہ پر برابر ضیا پاش ہوتا تھا۔

قاضی سراج احمدؒ کے تاریخی کارنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علمائے ماضیہ نہ صرف دینیات کے ماہر تھے بلکہ شعر و شاعری، فلسفہ، طب، ریاضی اور فنونِ لطیفہ میں بھی دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ اور موقع پر اپنے کمالات سے اس طرح استفادہ کرتے تھے کہ بڑے بڑے کامل الفن اُستاد اُنہیں "جگت گرو" تسلیم کرنے پر

مجبور ہو جاتے۔ "بابا ہری داس" بھی اسی قبیل کا افسانہ ہے۔

"میواڑ کی رانی" نے بہادر شاہ کے حملے کی تاب نہ لا کر جب ہمایوں کو پکارا تو وہ محاذِ جنگ چھوڑ کر اس کی امداد کو لپکا۔ اِس واقعہ سے ہندو مسلم تعلقات پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کی لڑائیاں محض ملک گیری کے لئے ہوتی تھیں۔ اگر بہادر شاہ مذہب کے نام پر حملہ کرتا تو ہمایوں سا متقی سُلطان ایک ہندو رانی کی خاطر اس سے نہ ٹکراتا!

"عرابتہ الاوسی" سے قرونِ اولیٰ کے جود و سخا کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس زمانہ کی داد و دہش کا یہ عالم سچ مچ افسانہ معلوم ہوتا ہے

"احمد بن الیاس" ایک پیرانہ سال وزیر ہے۔ اُس نے موت کو جس طرح خوش آمدید کہا اور مرنے کے لئے جس طرح اپنے آپ کو تیار کیا، اُس پر ہر مسلمان کو رشک آئے گا۔

"قمر النساء بیگم" نگم کے نواب کی اکلوتی صاحبزادی تھی۔ انگریز گورنر جنرل لارڈ کلائیو نے اِس ریاست کو ہڑپ کرنے کے لئے پہلے نواب کو ٹھکانے لگایا، پھر مسلمان رئیس کے بھیس میں شہزادی سے شادی رچانے کا ناپاک منصوبہ بنایا، مگر اس کی بے حیائی کا بروقت پتہ چل گیا۔ شہزادی نے کلائیو کو بیک بینی و دو گوش

اپنی ریاست سے نکال دیا، اور خود اسلامی آن پر سے تصدّق ہو گئی۔

یہ افسانہ انگریزوں کی شاطرانہ پالیسیوں کو بے نقاب، اور مسلمان شہزادی کی غیرت اور مظلومیت کی عکاسی کرتا ہے۔

"باغی پروانے" وفاشعاری اور اسلامی غیرت وحمیت کا حسین مرقع ہے۔

"تمباکو" سے اس کے مضر اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

خدائے قدوس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری یہ ناچیز کاوش توقع سے زیادہ مقبول ہوئی۔ محکمہ نے اسے کالجوں اور سکولوں کے لئے منظور کیا، اور ہیڈ ماسٹر صاحبان نے طلبہ کے زائد مطالعہ کے لئے فی سکول پچاس پچاس سیٹ خریدے اور ہفتے میں ایک پیریئڈ اس کے مطالعہ کے لئے مخصوص کیا۔ جن طلبہ نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے، ان کی آئندہ زندگی پر اس کا خوشگوار اثر پڑا ہے ایک مصنّف کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا انعام ہو سکتا ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

رائیٹرز کالونی — نور احمد خاں فریدی

ملتان شہر — یکم اپریل ۱۹۷۰ء

کسی زمانے میں

افسانہ اور حقیقت دو متضاد الفاظ تھے۔!

لیکن اب

افسانے کا معیار یہی ہے کہ وہ حقیقت سے بھرپور ہو

(سید وقار عظیم)

عمر

رضی اللہ عنہ

"یہ اونٹ سازوسامان کے ساتھ حاضر ہے، لے جائیں۔ اگر مہربانی ہو سکے تو یہ تلوار جو زین سے لٹک رہی ہے، مجھے عنایت کرتے جائیں۔ یہ حضرت علیؓ کی نشانی ہے۔ اور مجھے بے حد عزیز ہے!"

(عبداللہ بن جعفرؓ)

"واللہ! دُنیا بھر میں عرابہ سے زیادہ سخی اور کوئی نہیں!"

یہ ایک گرجدار آواز تھی۔ جو صحنِ کعبہ سے اُٹھی۔ اور ابو قبیسؓ کی پہاڑی سے ٹکرا کر رہ گئی۔ اور ابھی حرم میں اس گونج کا اثر باقی تھا، کہ ایک اور آدمی کے بولنے کی آواز آئی۔ جو پہلے آدمی سے کہہ رہا تھا۔

"عبیدہ! تم غلطی پر ہو۔ اِس وقت دُنیا میں عبداللہ بن جعفرؓ واحد بزرگ ہیں۔ جنہیں حاتمِ دوراں کا لقب دیا جا سکتا ہے۔"

اس پر پہلا آدمی جس کا نام ہم عبیدہ سُن چکے ہیں، برہم سا ہو گیا، اور بولا:

"عمر! ہرگز نہیں۔ عبداللہ لاکھ سخی سہی۔ مگر عرابہ سے لگا نہیں کھا سکتا۔" (نظریں عمر کے چہرے پر گاڑتے ہوئے) "سُنتے ہو! آج جُود و سخا میں عرابہ کا کوئی مثیل نہیں ہے!"

یہ دو آدمی اسی طرح ایک دُوسرے سے گرم ہو رہے تھے، لیکن ان کے پاس تیسرا آدمی جس کی عمر پچاس برس سے تجاوز کر چکی تھی، اور چہرے سے ضعیفی کے آثار ظاہر تھے، خاموش بیٹھا ان کی گرما گرم بحث دلچسپی سے سُن رہا تھا۔ جب عبیدہ نے دیکھا کہ عمر عرابہ کی فضیلت کا قائل نہیں ہوتا تو اس نے تیسرے رفیق کی طرف معنی خیز نگاہ ڈالی اور کہا:۔

"کیوں شیخ حارث! تمہارے نزدیک اِس وقت کون شخص دُنیا میں سب سے زیادہ فیاض ہے۔ عبداللہؓ بن جعفر یا عرابہ؟"

حارث نے مسکرا کر کہا:۔

"میں اِن دونوں میں سے کسی کو بھی اِس قابل نہیں پاتا کہ وہ دُنیا کا سب سے بڑا سخی کہلا سکے۔"

عبیدہ نے تعجّب سے اپنی نظریں حارث پر گاڑ دیں، اور کہا:۔

"تو کیا، آپ کے نزدیک کوئی اور شخص زیادہ فیاض ہے؟"

"ہاں! میں قیسؓ بن سعد کو سب سے زیادہ سخی جانتا ہوں!"

حارث نے متانت سے جواب دیا۔

یہ جواب سُن کر عمر تڑپ اُٹھا، اور کہا:۔ "میاں خدا خدا کرو! کہاں جعفر طیارؓ کے فرزند حضرت عبداللہؓ، اور کہاں بے چارا قیسؓ! جو ان کی غلامی میں اپنی سعادت خیال کرتا ہے ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

حارث نے بگڑ کر کہا:- "تم بھی عجیب ہو، یہاں شرافت اور فضیلت کا کیا ذکر۔ بحث تو یہ ہو رہی ہے کہ سب سے بڑا فیاض کون ہے، اور آپ جناب قیس کے پیچھے اس لئے پڑ گئے کہ وہ ابن جعفر کی عزّت کیوں کرتے ہیں —— اور ہاں —— یہ بھی ان کی فیاضی کی ایک بیّن دلیل ہے، کیونکہ فیاض لوگ عام طور پر حلیم الطبع اور منکسر المزاج ہوتے ہیں!"

عبیدہ نے حارث کو جھنجھوڑ کر کہا:- "ہاں مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ قیس سخاوت میں عبد اللہ سے کئی درجے بڑھ چڑھ کر ہے، مگر عرابہ کا درجہ ان دونوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔"

حارث نے جواب دیا:- "واللہ! تم عرابہ کے معاملہ میں مبالغہ سے کام لے رہے ہو۔ وہ بے چارہ تو نابینا ہونے کی وجہ سے خود غیروں کا محتاج ہے، دُوسروں کی حاجت روائی کیسے کر سکتا ہے؟"

عبیدہ نے کہا:- "اے حارث و عمر! تم دونوں اپنے اپنے دعویٰ میں دھوکہ کھا رہے ہو۔ عرابہ کی سخاوت اور بخشش تمام دُنیا پر اظہر من الشمس ہے۔ تمہاری تکذیب سے اس کی شہرت میں کمی واقع نہیں ہو سکتی!"

یہ تینوں حضرات اسی طرح آپس میں بحث کر رہے تھے کہ دفعتہً "بیرِ زمزم" کی جانب سے ایک آواز آئی :-

"بھائیو! لڑو جھگڑو نہیں۔ میں تمہارا ابھی فیصلہ کیے دیتا ہوں"۔ ساتھ ہی ایک بزرگ جن کے چہرے سے زُہد و تقویٰ کے آثار ظاہر تھے، صحن کعبہ میں داخل ہوئے۔ متوسط قد، نحیف جُثّہ، نورانی چہرہ، لمبی داڑھی، لبیں ترشی ہوئیں، پیشانی بلند اور کشادہ، ناک نہایت موزوں، آنکھیں علم اور مروّت کا پتہ دے رہی تھیں۔ سر پر عربی وضع کا ایک عمامہ باندھ رکھا تھا۔ ان حضرات نے جو ہی اس پیر مرد کو دیکھا فرطِ ادب سے کھڑے ہو گئے۔ کہا :-

"خُوب ہُوا، عبداللہ بن عمرؓ تشریف لے آئے!"

آپ نے قریب پہنچ کر فرمایا :-

"دوستو! ناحق جھگڑ رہے ہو۔ میں بڑی دیر سے آپ کی بحث سُن رہا تھا۔ بلاشبہ تینوں بزرگ اپنی اپنی جگہ پر بے حد فیاض ہیں، مگر دلیل کے بغیر کسی ایک کے حق میں برتری کا فیصلہ کرنا بے انصافی ہے۔ اگر واقعی کسی کو ترجیح دینا مطلوب ہے تو پھر آپ اپنے ممدوح کے پاس تشریف لے جائیں اور اپنے آپ کو مفلس و مسافر ظاہر کر کے امداد طلب کریں۔ جو کچھ اُن سے ملے یہاں لے آئیں۔ اس سے ہم اندازہ لگائیں گے

کہ کون سب سے زیادہ سخی ہے!"

حارث :- "آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے!"

عبیدہ :- "مجھے اس رائے سے اتفاق ہے"

عمرو :- "بالکل ٹھیک ہے!"

ابن عمر :- "بہتر! میں یہاں بیٹھا تمہارا انتظار کروں گا!"

حضرت کے فیصلے پر تینوں عرب اُٹھ کر چل دیئے۔

(۲)

عمروؔ یہاں سے نکل کر سیدھا حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے درِ دولت پر پہنچا۔ آپ اُس وقت دمشق جانے کے لئے اونٹ پر سوار ہو رہے تھے۔ ابھی پاؤں رکاب میں رکھا ہی تھا کہ عمروؔ آتا دکھائی دیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:-

"فرمایئے، کیسے آنا ہوا؟"

عمرو :- (مؤدبانہ انداز میں) "اے سرورِ عالمؐ کے چچازاد بھائی!

میں سفر میں ہوں اور سخت محتاج ہوں، میری مدد فرمایئے!"

یہ سُن کر حضرت عبداللہ اونٹ سے اُتر پڑے۔ فرمایا:-

"یہ اونٹ سازوسامان کے ساتھ حاضر ہے۔ لے جائیں۔ اگر مہربانی ہو سکے تو یہ تلوار جو زین سے لٹک رہی ہے عنایت کرتے جائیں، کیونکہ

یہ حضرت علی رضؓ کی نشانی ہے اور مجھے بے حد عزیز ہے۔"

عمرو نے تلوار کھول کر دے دی۔ اور خود اونٹ کی مہار تھامے کعبے کو روانہ ہوا۔ راستے میں خیال آیا کہ دیکھیں تو سہی اونٹ پر کیا کچھ ہے۔ بٹھا کر پڑتال کی تو چند ریشمی صدریاں اور چار ہزار اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ یہ دیکھ کر بے حد مسرور ہوا اور شاداں و فرحاں کعبہ کو چل دیا۔

(۳)

حارث جس وقت قیس بن سعد کے ہاں پہنچا۔ وہ اس وقت بستر پر لیٹے آرام کر رہے تھے۔ اُن کے غلام نے تعظیم کے ساتھ بیٹھنے کو جگہ دی اور کہا :۔

"آپ میرے آقا سے کیا چاہتے ہیں؟"

حارث :۔ "میں مسافر آدمی ہوں، زادِ راہ ختم ہو چکا ہے۔ آپ کے آقا خدا ترس آدمی ہیں اس لئے امداد چاہنے آیا ہوں!"

غلام :۔ "واقعی، میرے آقا بڑے نیک دل اور فیاض انسان ہیں۔ لیکن اس وقت وہ آرام فرما رہے ہیں، مگر آپ کو انتظار میں رکھنا نہیں چاہتا۔"

یہ کہہ کر غلام اندر گیا اور سات ہزار اشرفیوں کا توڑا اُٹھا لایا۔ کہا۔ "گھر میں جو کچھ تھا حاضر کر دیا گیا ہے۔ ہاں، اونٹوں کے محافظ

کے پاس یہ نشانی لے جائیے۔ وہ ایک خادم اور ایک اُونٹ آپ کو دے دے گا!"

حارث شکریہ ادا کر کے "مردہ" کی طرف اونٹ لینے چلا گیا۔ پیچھے جس وقت قیس نیند سے بیدار ہوا، غلام سے حقیقتِ حال سُن کر اس قدر خوش ہوا کہ اُسی وقت اُسے آزاد کر دیا۔ اور کہا اگر تم مجھے بیدار کر دیتے تو شاید میں سائل کی اس سے زیادہ خدمت کر سکتا۔

(۴)

عبیدہ نہایت سرعت سے قدم بڑھاتا ہُوا عرابہ کے مکان پر پہنچا، پتہ لگا کہ وہ نماز ادا کرنے کے لئے مسجد کو روانہ ہو چکے ہیں۔ یہ بھی ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ اور راستے ہی میں جا لیا۔ عرابہ بے چارا آنکھوں سے تو معذور تھا، سلام سُن کر ٹھٹک گیا۔ عبیدہ نے عرض کیا:۔

"اے حاتمِ دوراں! میں ایک غریب الدیار انسان ہوں۔ پیسہ پاس نہیں، آدمی کوئی واقف نہیں، لِلّٰہ امداد فرمائیے!"

عرابہ نے یہ سُن کر سر پیٹ لیا اور کہا:۔

"میں کیسا بدنصیب ہوں۔ سائل اُس وقت امداد کا طالب ہُوا جب میں خالی ہاتھ تھا۔ آہ اب میں کیا کروں ؎

صاحبا خجلتِ سائل بزمینم در کرد ٭ بے زری کرد بمن آنچہ بغارُوں زر کرد

پھر عبیدہ سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"بھئی افسوس ہے کہ اس وقت میں نقدی سے تمہاری امداد نہیں کر سکتا۔ یہ دو غلام جو میرے ہاتھ تھامے جا رہے ہیں، اگر آپ منظور کر لیں تو میں بے حد شکر گزار ہوں گا۔"

عبیدہ عرابہ کے اس ایثار سے حیران رہ گیا۔ اور کہا ۔"میں آپ کو ناجائز تکلیف دینا نہیں چاہتا۔"

مگر عرابہ نے بہت اصرار کیا۔ اور کہا:۔" اگر تم ان غلاموں کو قبول نہ کرو گے تو میں انہیں آزاد کر دوں گا!"

عبیدہ نے مجبور ہو کر غلاموں کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اور درخواست کی کہ" اگر اجازت ہو، تو میں آپ کو مسجد تک پہنچا دوں"۔ عرابہ نے جواب دیا:۔ "نہیں، مسافروں سے خدمت لینا شرفاء کا کام نہیں ہے۔" یہ کہا اور ہاتھوں سے دیوار ٹٹولتا ہوا مسجد کو روانہ ہوا۔

(۵)

حضرت ابن عمرؓ حرم کعبہ میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ ان تینوں اصحاب میں سے کون اپنے دعوی میں سچا اترتا ہے کہ عمرو داخل ہوا، اور کہا۔" السلام علیک یا ابن خلیفۃ رسول اللہ"

حضرت نے فرمایا:۔" وعلیکم السلام یا اخی! کیا کچھ لائے؟"

عمروؓ نے سامان پیش کرتے ہوئے کہا:۔ "جناب، ایک اونٹ چار ہزار اشرفی اور کچھ ریشمی صدریاں، اس وقت میرا ممدوح اونٹ پر سوار ہو کر سفر کو جا رہا تھا۔"

حضرت نے فرمایا:۔ "بہت خُوب!"

اتنے میں حارثؓ بھی آ پہنچا۔ حضرت کی نگاہیں اس طرف اُٹھ گئیں، مسکرا کر فرمایا:۔

"حارثؓ! بتاؤ، تمہیں کیا کچھ ملا؟"

"جناب! سات ہزار اشرفی، ایک اونٹ اور ایک غلام، اور یہ چیزیں میرے ممدوح کے خادم نے عطا کی ہیں۔ وہ اس وقت سو رہا تھا۔"

"لو عبیدہ بھی آ گئے"۔۔۔۔ عمروؓ نے دائیں طرف جھانکتے ہوئے کہا۔

"السلام علیک یا اصحاب رسول اللہ" عبیدہ نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اور اس کے ساتھ دو غلام تھے۔

ابن عمرؓ نے فرمایا:۔ "کیا لائے؟"

عبیدہ نے التماس کی۔۔۔۔ "جناب عالی! میرا ممدوح اس وقت نماز پڑھنے کے لئے مسجد کو جا رہا تھا۔ میں نے راستے ہی میں اس کو جا لیا بے چارا رونے لگ گیا کہ کاش میرے پاس نقدی ہوتی تو سائل کو دیتا

یہ کہہ کر دونوں غلام مجھے بخش دیئے اور خود ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتا ہوا مسجد کو روانہ ہو گیا۔"

حضرت ابنِ عمرؓ نے بے ساختہ کہا "یہ ایثار ہے، اے حارث! و، اے عمرو! تمہارا دوست تم سے بازی لے گیا۔"

حارث نے عرض کی۔ "واقعی عرابہ کا درجہ فیاضی میں سب سے بڑھ کر ہے!"

عمرو نے کہا:۔

"بے شک، عرابہ دنیا کا سب سے بڑا سخی انسان ہے!"

خواجہ احمدؔ ایاز

اس سے خواجہ کے چہرے پر یاس اور قنوط کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر فوراً سنبھلا اور سنبھل کر بولا :۔

"میرے جاں سپار دوستو! کیا اس بڑھاپے میں میرے لئے مناسب ہے کہ قیامت کو روسیاہی کا داغ چہرے پر لے کر قبر سے اُٹھوں! اب میں رضائے الٰہی پر راضی ہو چکا ہوں۔ جو خدا کو منظور ہو گا وہی ہو کر رہے گا!"

(احمد بن ایاز)

خواجۂ جہاں، ملک احمد ایاز وزیرِاعظم ہندوستان عصر کی نماز پڑھ کر جامع تغلق سے باہر نکل رہا تھا کہ اسے جمنا گھاٹ کی طرف سے ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا نظر آیا۔ ان دنوں سلطان محمد گجرات کی مہم پر گیا ہوا تھا۔ اور ملک احمد اس کی عدم موجودگی میں بطور نائب السلطنت کام کر رہا تھا۔ عرصہ سے بادشاہ کی خیریت کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ جس سے اس نمک خوار وزیر کی طبیعت پژمردہ سی رہتی تھی۔ اب جو دُور سے گرد اُڑتی نظر آئی تو ٹھٹک کر رہ گیا۔

اب سوار قلعہ کے دروازے قریب آ گیا تھا۔ خواجہ جہاں نے ایک امیر سے کہا:۔

"پتہ کرو، یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟"

تھوڑی دیر بعد امیر نووارد کو ہمراہ لے کر حاضر ہُوا۔

سوار نے مُنہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ کپڑوں پر گرد کی تہیں جم

رہی تھیں۔ سفر کی کلفت سے چور چور ہوا جاتا تھا۔ اس نے آتے ہی ڈھاٹا کھول دیا اور خواجہ جہاں کے قدموں پر گر پڑا۔

"اوہ، کون ــــ التون؟ ــــ میرا محبوب غلام!" خواجہ جہاں نے فکرمند ہو کر کہا:۔

"لشکرِ شاہی کو کیسے چھوڑا؟"

"میں خلوت میں عرض کروں گا میرے آقا! ــــ" غلام نے ہانپتے ہوئے عرض کیا۔

خواجہ جہاں التون کو ہمراہ لے کر فوراً ایک گوشے میں پہنچا، اور کہا:۔ "جو کچھ کہنا ہو، جلد جلد کہہ ڈالو!"

التون نے رازدارانہ طور پر کہنا شروع کیا:۔

"میرے آقا! ــــ آپ کا سلطان دُنیا سے چل بسا ــــ مُغلوں نے لشکر لُوٹ لیا ــــ تاتار خاں اور فیروز خاں گُم ہیں۔ خدا معلوم مغلوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے یا کہیں مارے گئے؟"

فرطِ غم سے خواجہ جہاں بے قرار ہو گیا، مگر دامنِ صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ زیرِ لب انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور بولا "اے غلام! تُو نے بڑی منحوس خبر سُنائی!"

التون:۔ "خداوندِ نعمت، تقدیر سے چارہ نہیں!"

خواجہ جہاں :۔ "سُلطان نے کب اور کہاں انتقال کیا؟"

التون :۔ "اے خواجہ جہاں! ہندوستان کے شہنشاہ نے ۲۱ محرّم ۷۵۲ھ کو ٹھٹھ کے مقام پر اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی۔"

خواجہ جہاں :۔ "کچھ وصیّت کا بھی علم ہے؟"

التون :۔ "اتنا سُنا گیا تھا کہ سُلطان نے فیروز خاں کو اپنی رعایا پر شفقت کرنے کی تلقین کی اور مرنے سے پہلے یہ اشعار پڑھے ؎

بسیار دریں جہاں چمیدیم　　بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشستیم　　ترکان گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط آخر
چو قامتِ ماہِ نو خمیدیم"

"آہ سلطان! تیرا وجود بھی ایک طوفان تھا!" یہ کہہ کر خواجہ جہاں ٹھنڈے سانس بھرتا ہوا دیوانِ خاص میں آیا اور اُمرائے دولت کو اس سانحہ سے مطلع کر کے ماتم میں ہو بیٹھا۔ اُس وقت خواجہ کو دُگنا غم تھا ایک تو بادشاہ کے مرنے کا اور دُوسرا فیروز خاں کی گمشدگی کا۔ کیونکہ خواجہ جہاں فیروز خاں سے دلی محبت کرتا تھا اور سلطان کی وصیّت کے بموجب اسی کو ہی تاج و تخت کا مالک دیکھنا چاہتا تھا۔

چند یوم اسی طرح گزر گئے۔ فیروز خاں کی کوئی اطلاع موصول نہ

ہوئی۔ فتنہ و فساد کے ان ایّام میں تخت کا بادشاہ سے محروم رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے خواجہ جہاں نے سُلطان مرحوم کے فرزند کو تخت نشین کر دیا اور خود کاروبارِ سلطنت کو نہایت مستعدی سے سرانجام دینے لگا۔

ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک دن اطلاع آئی کہ سلطان فیروز تخت پر بیٹھ چکا ہے اور پایۂ تخت کی طرف بڑھا چلا آتا ہے۔ خواجہ جہاں کو شہزادے کے تخت نشین کرنے پر افسوس ہُوا، مگر اب غلطی ہو چکی تھی۔ اس لئے اُس نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ آنے والے خطرہ کے لئے لشکر تیار رکھے۔ اور جب تک صلح کی کوئی صورت نہ نکلے بے فکر نہ رہے چنانچہ اس نے بیس ہزار کے قریب فوج فراہم کر لی۔ مگر خزانہ تو ستائیس سالہ جُود و سخا کے سبب خالی ہو چکا تھا۔ اور اگر کچھ تھا بھی تو چند دنوں میں ختم ہو گیا۔ اِس لئے خواجہ نے تالیفِ قلوب کے لئے سونے چاندی کے برتن اور جواہرات دینے شروع کئے۔ لیکن چونکہ سلطان فیروز نہایت فیاض اور عدل پرور نوجوان تھا، اس لئے رعایا اس کی حکومت کی خواہاں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ امرار اور اکابرِ سلطنت ادھر کو بھاگنے لگے۔ جب خواجہ جہاں نے لوگوں کے اس میلان کو دیکھا تو اُسے بادشاہ سے مقابلہ کرنا سودمند نظر نہ آیا۔ لہٰذا اپنی جمعیت کو ہمراہ لے کر ہانسی جا پہنچا۔ ہوا خواہ امرار نے حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ تو سلطان فیروز کی خدمت میں جا رہے ہیں۔ ہمارے

متعلق کیا حکم ہے ؟"

خواجہ جہاں نے فرمایا :-

" اے یارانِ بے ریا ! سلطان محمدؔ کے بیٹے کو بادشاہ بنانے میں میری کوئی ذاتی طمع مضمر نہ تھی۔ جب میں نے سُنا کہ سلطان نے وفات پائی۔ لشکر کو مغلوں نے لوٹ لیا۔ اور تاتار خاں و فیروز خاں وہاں سے غائب ہیں تو میں نے ملک کی بھلائی اور خلق کی بہبودی کی خاطر محمد شاہ کے فرزند کو بادشاہ بنا دیا۔ میں نے بہت سی خطائیں اور غلطیاں کی ہیں مگر وہ سب خلق کے دباؤ اور شور و غل سے۔ دگرنہ مجھے بادشاہی سے کیا کام تھا۔ میں سلطان فیروز کو محمد شاہ کے عہد میں بیٹا کہتا تھا اور وہ مجھ کو باپ ، میری بہو بیٹیاں اس کے گھر میں جاتی تھیں۔ اگرچہ میں نہیں جانتا کہ خدا کو کیا منظور ہے ، مگر سلطان فیروزؔ نیک مرد ہے۔ مجھے بھی اور تم کو بھی معاف کر دے گا !"

خواجہ جہاں اَسّی سال کا پیر مرد ، جس کے سر کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے۔ یہ کہہ رہا تھا۔ اور اس کے خیر سگال دوست رو رہے تھے۔ جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو انہوں نے متفق ہو کر عرض کیا :-

" اے خواجہ جہاں ! بادشاہوں کا یہ دستور ہے کہ امورِ حکومت میں باپ بیٹے کے تعلقات کی پرواہ نہیں کرتے۔ سہو اور غلطی میں تمیز نہیں

کرتے۔ فیروز شاہ لاکھ نیک مرد سہی مگر وہ دستورِ قدیم کے خلاف نہ چلے گا۔"

اس سے خواجہ کے چہرے پر یاس و قنوط کی ایک لہر دوڑ گئی مگر فوراً سنبھلا اور سنبھل کر بولا:۔

"میرے جاں سپار دوستو! اگر میں واپس دہلی جا کر قلعہ بند ہو بیٹھوں تو گرچہ میرے پاس لشکر اور ہاتھی بکثرت موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سلطان فیروز دہلی کو فتح کرلے گا۔ اس سے مسلمانوں کی عورتیں نااہلوں کے ہاتھ پڑیں گی۔ کیا اس بڑھاپے میں میرے لئے مناسب ہے کہ قیامت کو روسیاہی کا داغ چہرے پر لے کر قبر سے اٹھوں۔ اب میں رضائے الٰہی پر راضی ہو چکا ہوں۔ جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہو کر رہے گا!"

امراء نے جب دیکھا کہ خواجہ جہاں سلطان کے دربار میں جانے پر مُصر ہے تو کئی واپس لوٹ گئے اور کئی اس کے ہمراہ روانہ ہوئے۔

(۲)

ظہر کا وقت تھا۔ فیروز بخت سلطان فتح آباد میں کرسی پر بیٹھا دربار کر رہا تھا کہ دور سے خواجہ جہاں اس ہیئت میں آتا ہوا دکھائی دیا۔ پگڑی سر سے اُتری ہوئی۔ سر ننگا اور منڈا ہوا۔ تلوار برہنہ مگر گلے میں حمائل، شرافت مجسّم سلطان نے فوراً ایک امیر کو بھیجا کہ جا کر پگڑی بندھوائے اور چہ ڈول زرّین جو خاص اس کی سواری کا تھا بھیج کر ہدایت کی کہ خواجہ

جہاں کو باغ کے تختہ میں بٹھایا جائے۔ ریں وہیں ملاقات کو آتا ہوں!

امرائے دربار نے جو علی الاعلان خواجہ کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ بادشاہ کو ادھر جھکتے دیکھا تو سب نے دست بستہ عرض کی۔

"اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ بادشاہ ہو گئے۔ دہلی بھی فتح ہو گئی اور خواجہ جہاں بھی خدمت میں پہنچ گیا۔ اب کسی قسم کا خدشہ نہیں رہا۔ مسلمان پر ایک حج فرض ہوتا ہے۔ جہاں پناہ ہم سب کو حج کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں!"

سلطان ان کا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر بولا۔" جب کبھی امیروں وزیروں سے لغزش ہوئی ہے، گزشتہ سلاطین نے ہمیشہ ان سے درگزر کی ہے۔"

انہوں نے عرض کی:۔

" ولی نعمت! گناہ دو طرح کے ہیں، ایک کبیرہ دوسرے صغیرہ صغیرہ گناہ معاف کر دیئے جائیں تو کچھ قباحت نہیں، مگر کبیرہ گناہوں سے درگزر کرنے میں انجام کار بڑی پشیمانی ہوتی ہے۔ خواجہ جہاں نے دنیاوی لالچ سے ایک معصوم بچے کو تخت پر بٹھا دیا۔ خزانے کا سارا روپیہ برباد کر دیا۔ اور جب کچھ نہ رہا تو سونے چاندی کے برتن اور جواہر دے ڈالے اس پر بھی جب وہ رعایا کو اپنا طرفدار نہ بنا سکا تو مجبوراً جہاں پناہ کی

خدمت میں حاضر ہُوا۔ اگر اُسے ہم پر غلبہ حاصل ہوتا تو کسی کو زندہ نہ چھوڑتا۔ جو ہماری سمجھ میں آیا عرض کر دیا۔ آگے بادشاہ کو اختیار ہے!"

(۳)

بادشاہ خواجہ جہاں کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اور اُسے شہزادگی کے زمانہ میں آبا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ جب دیکھا کہ سارا دربار اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ دربار برخاست کر کے خواجہ جہاں سے ملاقات کی اور پھر محل سرا میں چلا گیا۔

اِس صدمہ نے فیروز شاہ کے قلب و دماغ پر اتنا بُرا اثر ڈالا، کہ وہ بیمار ہو گیا۔ اور کئی دن تک باہر نہ نکلا۔ آخر کار ایک دن عمادالملک کو بُلا کر کہا:۔

"میں خواجہ جہاں کا معاملہ تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ جو مناسب معلوم ہو کرو۔"

عمادالملک نے دست بستہ عرض کی:۔

"خواجہ شمعِ سحری ہو رہا ہے۔ اسے سامانہ کا موضع جاگیر میں دے کر رخصت کر دیا جائے، تاکہ باقی عمر عبادتِ الٰہی میں بسر کرے!"

خواجہ جہاں اپنے متعلق یہ حکم سُن کر سامانہ کو چل پڑا۔ لیکن ابھی چند منزلیں طے کی تھیں کہ عقب سے شیر خاں اُسے آملا۔ خواجہ نے معلوم

کرلیا، کہ یہ میرے لئے عزرائیل بن کر آیا ہے۔ کہا:۔

"ذرا مجھے دُوسرے خیمے تک جانے کی اجازت دی جائے!"

وہ اس میں جا کر نماز پڑھنا چاہتا تھا۔ شیر خاں نے اجازت دے دی۔ خواجہ فی الفور خیمہ میں پہنچا۔ وضو کر کے نماز شروع کرنا چاہتا تھا کہ قاتل ننگی تلوار ہاتھ میں لئے داخل ہوُا۔

خواجہ اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ پوچھا:۔

"تمہاری تلوار تیز ہے؟"

قاتل نے تلوار دکھائی۔ خواجہ نے اُلٹ پلٹ کر غور سے دیکھی اور پھر واپس کردی۔ کہا:۔

"جب میں نماز سے فارغ ہولوں، تب مجھ پر وار کرنا!"

اس کے بعد خواجہ نے نماز شروع کی۔ رکوع کے بعد، سجدہ کے لئے سر زمین پر رکھا۔ دو دفعہ سُبحان ربیّ الاعلیٰ کا ورد کیا۔ تیسری بار "سُبحان" کا لفظ زبان پر تھا کہ شیر خاں نے تلوار مار کر سر تن سے جُدا کردیا۔

○

اے بادشاہ! تُو کہاں ہے؟

"اے بادشاہ! تیری بد قسمت رعایا جان بچانے کے لئے تیری طرف دوڑی۔ مگر کرشنا کے مہیب افعی نے اسے تیرے قدموں تک نہ پہنچنے دیا۔ انہوں نے دشمنوں کے مقابلہ میں دریا کی لہروں کو ترجیح دی۔ وہ اس بحرِ قہار میں کود پڑے، بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، مگر اُس کی خوفناک موجوں سے زندہ و سلامت نہ بچ سکے۔ جب میں کرشنا سے نکل کر ادھر کو روانہ ہوا۔ دریا کی پُر شور موجوں میں ڈوبنے والوں کی پکار برابر سنائی دے رہی تھی کہ اے بادشاہ! تو کہاں ہے؟"

(ایک سپاہی)

فیروز شاہ بہمنی کو شکار سے شغف نہیں بلکہ عشق تھا۔ ہفتے میں دو بار خاصہ فوج کے جاں باز ہمراہ لے، پچھلی رات کو دارالحکومت سے نکلتا۔ اور پٹن کے مضافات میں شکار کھیل کر پہر دن چڑھے واپس آکر دربار لگاتا تھا۔ اگرچہ بظاہر اس معمول سے غرض تفریح تھی۔ مگر حقیقت میں شکار محض بہانہ تھا۔ مقصود اس سے فوج کو حرب و ضرب کے لئے تیار رکھنا تھا!

۱۳۰۱ء میں سلطان شکار کے لئے گلبرگہ سے روانہ ہوا۔ بارہ ہزار جاں نثار جن کے سروں پر جواہر نگار فولادی خود عجب بہار دے رہے تھے، ہمرکاب تھے۔ اور احمد خاں سپہ سالار دائیں پہلو میں تھا۔ دونوں بھائی[1] آپس میں باتیں کرتے گھوڑے اُڑائے چلے جاتے تھے کہ پٹن کے قریب لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رُک گئے۔ معلوم ہوا، دریا پار سے کوئی سپاہی

---

[1] احمد خاں سپہ سالار سلطان کا چھوٹا بھائی تھا!

زخمی ہو کر آیا ہے اور پڑا دم توڑ رہا ہے۔ بادشاہ جست لگا کر گھوڑے سے اُترا۔ قریب جا کر دیکھا کہ ایک مسافر فوجی لباس میں زمین پر چت لیٹا ہے، کپڑے خون سے لت پت ہو رہے ہیں۔ اتنے میں لشکرِ سلطانی آپہنچا معالجِ شاہی نے زخموں کو دھو کر مرہم کے پھاہے رکھے، اور مُنہ میں "آبِ حیات" کے چند قطرے ٹپکائے۔ سپاہی نے آنکھیں کھول دیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے شہنشاہ کو دیکھنے لگا۔ گویا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ عالمِ خواب ہے، یا حالتِ بیداری!

بادشاہ سپاہی کے پاس بیٹھ گیا۔ شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور نرمی سے بولا۔

"میرے بہادر بول! تجھے کس بدبخت نے زخمی کیا؟"

سپاہی رو پڑا اور بادشاہ کے قدموں سے آنکھیں ملتے ہوئے بولا:
"میں کیا کہوں عالم پناہ! کہتے ہوئے زبان لرزتی ہے۔ میرے آقا! دریا پار کی تیری ساری رعایا کٹ چکی۔ مدکل اور راچور تباہ کر دیئے گئے!"
سپاہی کمزوری کے سبب بولتے بولتے رُک گیا، اور ملتجیانہ نگاہوں سے بادشاہ کو دیکھنے لگا۔

سلطان نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے مظلوم بیٹے کہے جا!"۔
۔ اور پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا۔ "آہ میری غریب رعایا!"

سپاہی نے اپنی پوری قوّت کے ساتھ بولنا شروع کیا:۔

"اے بادشاہ! تیری بد قسمت رعایا، جان بچانے کے لئے تیری طرف دوڑی، مگر کرشتا کے مہیب افعی نے اُسے تیرے قدموں تک نہ پہنچنے دیا اس نے دُشمن کے مقابلے میں دریا کی لہروں کو ترجیح دی، تیرے جاں نثار اس بحرِ قہار میں کُود پڑے۔ بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر اس کی خوفناک موجوں سے زندہ وسلامت نہ بچ سکے۔ جب میں کرشتا سے نکل کر اِدھر کو چلا آتا تھا، دریا کی پُرشور موجوں میں ڈُوبنے والوں کی پکار برابر سنائی دے رہی تھی کہ "اے بادشاہ! تُو کہاں ہے؟"— !"

بادشاہ کا چہرہ غصّہ سے لال پیلا ہو گیا اور رنج وغم سے دانت پیستے ہوئے بولا:۔

"بدبخت دیوراۓ! اپنے بزرگوں کی بدنامیوں اور رُسوائیوں کو بھول گیا!"

پالکی منگوا کر سپاہی کو اس میں آرام سے لٹایا اور چند ملازم ساتھ کر کے دارالحکومت کو روانہ کیا۔ پھر کرنا ہاتھ میں لے کر اس زنّاٹے سے پھونکی کہ جنگل گونج اُٹھا۔ تمام فوج الیمانی تلواریں ہاتھ میں لے کر شاہی حکم کا انتظار کرنے لگی۔ دفعتہً بادشاہ کی بارعب آواز بلند ہوئی:۔

"میرے وفادار دوستو! ہم جنگلی ہرنوں کا شکار کرنے آئے تھے، مگر

قضا و قدر نے "بیجا نگرؔ کے درندوں کو بھیج دیا۔ اب اُن سے مُنہ موڑ کر پیچھے لوٹنا جوانمردی کا مُنہ کالا کرنا ہے۔ اِس لئے جس کو سوچنا ہے وہ سوچ لے اور جس کو حقِ نمک ادا کرنا ہو وہ ہمارے پیچھے گھوڑا سرپٹ ڈال دے!" یہ کہہ کر سلطان لپک کر "شبدیز" پر سوار ہو گیا اور اُسے ایڑ لگا دی۔ ہفتوں کی منزلوں کو لپیٹ کر تیسرے دن کرشنا کے کنارے جا کھڑا ہوا پیچھے مُنہ پھیر کر دیکھا تو ساری فوج مرنے مارنے پر کمربستہ پائی۔

دریا کالے ناگ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اور پار دیو رائے کی فوج ناکہ بندی کے لئے پڑی تھی۔ سلطان گھوڑے سے اُتر کر سپہ سالار کے ہمراہ پہاڑی پر چڑھ گیا۔ چوٹی پر جا کر دیکھا تو کرشنا اس سرعت سے بہتا نظر آیا، گویا پہاڑوں کو بھی کاٹ کر بہالے جائے گا اور پھر پاٹ میلوں تک پھیل رہا تھا۔

بادشاہ کا دل ڈوب گیا اور افسردہ خاطر ہو کر نیچے اُترنے لگا۔ پیادے چند ملاحوں کو گرفتار کر لائے تھے اور اُن سے دُشمن کی فوج کا پتہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دیو رائے ایک لاکھ تیس ہزار سواروں سے کئی میلوں میں کیمپ لگائے پڑا ہے اور سامان اس قدر ہمراہ لایا ہے کہ اگر پانچ سال بھی یہیں گزارنے پڑ جائیں تو اور منگوانے کی ضرورت نہ پڑے اس خبر سے فیروز شاہی امراء کے اوسان خطا ہو گئے۔ عالم خاں افغان نے

گھبرا کر کہا:۔

"جہاں پناہ! اس میں کچھ شک نہیں کہ لشکرِ سلطانی کا ایک ایک سپاہی دس دس کنہروں پر بھاری ہے۔ مگر یہاں تو ایک کے مقابلے میں ایک سو سپاہی پڑا ہے۔ اور پھر ہاتھیوں اور توپوں کی مار الگ ہے۔ ساتھ ہی کرشنا کی طغیانی کا یہ عالم ہے کہ سوائے اِس گھاٹ کے اور کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں سے فوج گزر سکے۔ ایسے حالات میں اتنے خوفناک دشمن سے ٹکر لینا جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا ہے!"

سلطان نے کہا:۔

"یہ سب درست ہے، مگر مسلمانوں نے دشمن کی کثرت پر کبھی غور نہیں کیا۔ اور قرآنِ حکیم کا یہ ارشاد ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہا ہے کہ:۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ.

وَاللهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

اگر مٹھی بھر مسلمانوں سے طارق اندلس کے لاکھوں نبرد آزما سپاہیوں کو شکست دے سکتا ہے، اور اگر عرب کا سترہ سالہ جرنیل محمد بن قاسم چند ہزار شامیوں سے داہر کی بے قیاس افواج کا قلع قمع کر سکتا ہے، تو فیروز بھی بارہ ہزار جاں بازوں سے دلورائے کا خاتمہ کر سکتا ہے"۔

احمد خاں نے دست بستہ عرض کی:۔

"ظلِّ اللہ کا ارشاد بجا، مگر طارق اور ابنِ قاسم کی فوجیں ہزاروں میل گھر سے دور تھیں، اُن کو تخت یا تختہ کے سوا کوئی صورت نظر نہ آسکتی تھی اس لئے انہوں نے ذلّت کی موت پر شہادت کی عزّت کو پسند کیا، اور کامیاب ہوئے، مگر یہاں ہر شخص گھر کے قریب پڑا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ بھاگ کر جان بھی بچائی جاسکتی ہے۔ پھر اس دفعہ طغیانی کا یہ عالم ہے گویا مالابار کے تمام پہاڑ پگھل کر اسی دریا میں بہہ آئے ہیں۔ یا مون سون ہواؤں نے بحیرۂ عرب کو اٹھا کر کرشنا میں دے پٹکا ہے۔"

میاں سدھو بڑھ کر بولے :۔

"بہتر یہ ہے کہ ہم اسی طرح دشمن کا رستہ روکے پڑے رہیں، وہ کسی طرح کرشنا کو عبور نہیں کرسکتا! اور اگر اس نے جرأت کی بھی تو اس کا کوئی متنفّس زندہ اِس کنارے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اِس اثنا میں تمام مملکت میں پروانے بھیج کر کمک منگوائی جاسکتی ہے، زیادہ نہ سہی مگر لاکھوں کے مقابلہ میں ہزاروں جاں نثاروں کا ہونا تو نہایت لازمی ہے۔"

بادشاہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا :۔

"جب سے میں نے مدگل اور رائچور کی تباہی کی داستان سُنی ہے اُس وقت سے رات کی نیند اور دن کا آرام مجھ پر حرام ہوچکا ہے، جب سونے لگتا ہوں، مظلوم رعایا خواب میں آکر مجھ سے فریاد کرتی ہے اور اس

کی یہ صدا "اے بادشاہ! تو کہاں ہے؟" آٹھوں پہر میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔ اس لیے کسی صورت میں بھی آپ صاحبان کا مشورہ میرے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ ہاں واپس جانے کی ہر شخص کو اجازت ہے۔"

یہ کہہ کر سلطان نے امرائے دربار پر افسردہ نگاہوں سے نظر ڈالی اور اپنے خیمہ میں داخل ہو گیا۔

قاضی سراج احمد جو دربار کے بہت بڑے عالم اور گلبرگہ کے چیف جسٹس تھے، اب تک خاموش کھڑے امرائے لشکر کی تقریریں سُن رہے تھے، جب بادشاہ چلا گیا تو انہوں نے احمد خاں خانِ خاناں سے کہا:۔

"آپ نے یہ بہت بُرا کیا کہ سلطان کو ناراض کر دیا۔ اُس کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ دیو رائے سے جنگ کئے بغیر کبھی نہ لوٹے گا۔"

احمد خاں نے آشفتہ ہو کر کہا:۔

"عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر زید بکر کو توپ دُم کرا دینا آسان ہے لیکن میدانِ جنگ کی گتھیوں کو سلجھانا بہت مشکل۔ اگر دعوائے جوانمردی ہے تو کچھ کر کے دکھائیے۔"

قاضی صاحب نے ہنس کر کہا۔ "دُعا کیجئے، ممکن ہے کہ مسندِ قضا پر

بیٹھنے والوں سے بھی کوئی ایسی خدمت انجام پا جائے، جو بڑے بڑے نبرد آزما سپہ سالار انجام نہ دے سکیں ؎

گاہ باشد کہ کودکے ناداں
ز غلط بر ہدف زند تیرے

یہ کہہ کر سیدھا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سلطان کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ آہٹ پا کر آنکھ اٹھائی۔ قاضی صاحب کو دیکھ کر فرمایا ؎

طبیبا! یکے دفترِ خویش بکشا
مگر دردِ ما را دوائے بر آید

قاضی صاحب نے زمینِ خدمت کو چوم کر عرض کیا:۔

"اگرچہ یہ غلام میدانِ حرب و ضرب کا شہسوار نہیں، مگر جان پر کھیل جانا خوب جانتا ہے۔"

سلطان کے پژمردہ چہرے پر مسرت اور شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی، فرمایا:۔

"قاضی صاحب! میں جانتا ہوں کہ خداوندِ پاک نے جہاں آپ کو قرآن فہمی اور عدل گستری کی دولت سے مالا مال کیا ہے، وہاں شجاعت و بسالت بھی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ آپ کو اپنے ہمراہ رکھتا ہوں۔"

قاضی صاحب ادائے شکریہ کے لئے جھک گئے۔ کہا:۔

"عالم پناہ کی ذرّہ نوازی ہے کہ غلام پر اس قدر شفقت فرماتے ہیں ناچیز کے ذہن میں اس وقت ایک تجویز آئی ہے۔ اگر اجازت ہو تو عرض کی جائے۔"

"ہاں ہاں ضرور کہو" بادشاہ نے متبسّم ہو کر کہا، اور اس نے ایسا محسوس کیا۔ گویا بڑا بھاری بوجھ اُس کے سینے سے ہٹایا جا رہا ہے۔

قاضی نے دوبارہ زمینِ خدمت کو چوما اور کہا:۔

"دیو رائے اور اس کا ولی عہد رات کو ہمیشہ مجلسِ عیش گرم کیا کرتے ہیں۔ اگر ظل اللہ اجازت دیں تو یہ غلام اپنے رفقار کی مدد سے ان پر شب خون مارے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کا قتل ہو جانا یقینی ہے اور جس وقت کنہریوں کے لشکر سے شور و غل کی آواز اُٹھے ــــ حضور خاطر جمعی سے دولت و اقبال کو رکاب میں لے کر دریا کو عبور کر آئیں!"

"ہاں، تجویز تو خوب ہے۔ اس سے دشمن کی فوج کا شیرازہ بکھر جائے گا اور اچھی طرح سے پامال کیا جا سکے گا۔ مگر آج ایسے خیر سگال کو اتنے خطرے میں بھی تو نہیں ڈالا جا سکتا۔"

"اس امر کا آپ فکر نہ کریں۔ جس خدائے حیّ و قیّوم نے آپ کو اتنا اقبال بخشا ہے، وہی آپ کے نمک خوار کی حفاظت کو کافی ہے۔"

یہ کہہ کر قاضی صاحب کھڑے ہو گئے۔ سُلطان نے بادلِ ناخواستہ اپنے جاں نثار کو گلے سے لگا کر اپنی دُعاؤں کے سایہ میں رخصت کیا۔

(۲)

قاضی سراج نے اپنے رفقا کو جمع کر کے اُن میں سے سات یک دل اور یک زبان جوان منتخب کئے۔ اور انہیں جوگیانہ لباس پہنا، خود زرد رنگ کی ایک چادر آدھی اوپر اور آدھی نیچے پہن، کشکول بغل میں ڈال چمٹا ہاتھ میں لے احمد خاں کے خیمہ میں داخل ہؤا اور ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ وہ حیران ہو کر بولا :-

"قاضی صاحب! یہ کیا؟"

کہا ——" جب آپ ہمیں مردِ میدان ہی نہیں سمجھتے، تو پھر یہاں رہنے سے کیا فائدہ؟ سے

بنائیں کیا سمجھ کر خاکِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا"

پھر مسکرا کر سپہ سالار کو آغوش میں لے لیا۔ اور آہستہ سے کان میں کہا۔ "آج رات کو راجہ یا اس کا راجکمار ضرور مارا جائے گا۔ اور یہ کام آپ کا یہی حرب نا آشنا قاضی انجام دے گا۔ جس وقت دشمن کے لشکر سے شور و غل کی آواز بلند ہو۔ چار پانچ ہزار نبرد آزمائے کر دریا عبور کر آئیے رہم کرتے کرتے

گھاٹ تک آ پہنچیں گے۔ انشاء اللہ آگے راستہ صاف ہوگا۔"

سپہ سالار نے فرطِ تعجب سے گھور کر قاضی صاحب کو دیکھا اور کہا "کیا یہ درست ہے؟"

"بالکل!"۔ قاضی صاحب نے متانت سے جواب دیا۔

"شاباش! خدا کی مدد تمہارے شاملِ حال ہو"۔ احمد خاں نے محبّت سے قاضی صاحب کو بغل میں لے لیا اور کہا:۔

"بھائی! واقعی تم بہادر ہو۔ میں نے طنزاً جو الفاظ کہے تھے، اُن کی معافی چاہتا ہوں۔ ہاں اتنا کرنا کہ جونہی تمہیں اپنے ارادے میں کامیابی ہو، پہاڑ پر آگ جلا دینا۔ شور و غل ممکن ہے سُنائی نہ دے، لیکن آگ میلوں تک نظر آسکتی ہے۔"

"بہتر، ایسا ہی ہوگا!"

اتنے میں قاضی صاحب کے ساتھی چمڑے کی ٹوکریاں لے کر حاضر ہوئے جو دریا عبور کرنے کی غرض سے خاص طور پر تیار کئے گئے تھے۔ اور قاضی صاحب احمد خاں خانخاناں کو آخری سلام کر کے رخصت ہوئے۔

(۱۲)

دوپہر کا وقت تھا۔ شدّت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ آفتاب نصف النّہار پر جھک کر انگارے برسا رہا تھا۔ کرشنا کے دونوں کناروں پر حضرتِ آدم

کی اولاد تلواروں کو زہر میں بجھائے ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ ہابیل قابیل کے خاکے میں قدرت پھر رنگ بھرنا چاہتی تھی، مگر گرمی کی تپش سے سب لوگ اپنے خیموں میں چھپے پڑے تھے۔ دریا کے چڑھاؤ کا یہ عالم تھا کہ دوسرا کنارہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ کوہ دقار موجیں اُٹھ اُٹھ کر آسمان کو چوم رہی تھیں۔ کنھری دیدبان اسی ماحول میں پہاڑی پر کھڑا دریا کے پاٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اُسے سطح آب پر چند سیاہ دھبے نظر آئے۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کے گرد ہالہ بنا کر غور سے دیکھا۔ پھر نرسنگھ ہاتھ میں لے کر اتنے زور سے پھونکا کہ سوتے جاگتے سب اُچھل پڑے۔ پہرے دار کھانڈے اور کٹار سنبھال گھاٹ پر آموجود ہوئے۔ سب نے نظریں اُٹھا اُٹھا کر تیرنے والوں کو دیکھنا شروع کیا اگرچہ دریا تیزی سے بہ رہا تھا۔ مگر تیراک کئی ایسے زبردست تھے کہ تیر کی طرح پانی کو چیرتے اور سطح آب پر لپکے چلے آتے تھے۔ قریب آئے، تو رسالدار نے گھور کر دیکھا اور ہنس کر کہا۔ یہ تو کوئی جوگی معلوم ہوتے ہیں، مسافر دریا سے نکلے ہی تھے کہ کنھریوں نے انہیں گھیر لیا اور اپنی زبان میں طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ درحقیقت یہ مسافر قاضی صاحب اور ان کے رفقا تھے۔ قاضی صاحب تو اچھے خاصے سادھو معلوم ہوتے تھے، انہوں نے کنھری زبان میں رسالدار کو نمسکار کیا۔ اُس نے درشتی سے کہا۔

"تم کون لوگ ہو اور کس غرض سے ہمارے لشکر میں آئے ہو؟"

"بابا، ہم سادھو لوگ ہیں، جگہ جگہ پہنچ کر دیوی دیوتاؤں کے درشن کرتے پھرتے ہیں، کاشی سے آرہے ہیں اور وجے نگر میں "شری رنگ" کی یاترا کو جانے کا ارادہ ہے!"

"مجھے تو شبہ پڑتا ہے کہ تم جاسوسی کی غرض سے یہاں آئے ہو۔" رسالدار نے غصّہ بار نظروں سے گھور کر کہا۔

"رام، رام! رام رام! مہاراج آپ یہ کیا کہتے ہیں؟ فقیروں سے مذاق اچھی بات نہیں، ہم دُنیا تیاگ چکے۔ اِن مُورکھ دھندوں سے مُنہ موڑ چکے، پھر ہم کسی کی جاسُوسی کیوں کرنے لگے؟"

رسالدار اِس جواب سے کچھ ٹھنڈا ہُوا اور بولا:-

"باباجی! جنگ کے شعلوں میں گرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ کیا وجے نگر کا کوئی اور راستہ نہ تھا؟ اِن دنوں منش تو بجائے خود رہا، اُس کے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے۔ اب جب تک یُدھ ختم نہیں ہوتا، آپ کو یہاں قید رہنا پڑے گا۔"

قاضی نے نعرہ لگایا۔ "الکھ نرنجن" ہمیں کون مُورکھ روک سکتا ہے، ارے بابا دو دن ہم ملیکشوں کے ہاں رہے، آنے سے تو اُنھوں نے بھی نہ روکا۔ بلکہ اُن کے سیناپتی فیروز مہاراج نے دریا گزار نے کے لئے نوکرے

دلائے۔ دیودائے کے لشکر میں آکر ہم قید بھگتیں! — چلو ہم راجہ کے پاس چلتے ہیں۔ اگر تمہیں کرشنا میں ڈبکیاں نہ دلواؤں تو رام داس نام نہیں!" رسالدار ڈر گیا اور کہا، "باباجی معاف کرو، جاؤ جہاں جانا ہو۔ ہم تمہیں نہ روکیں گے۔"

قاضی نے لال پیلی آنکھوں سے رسالدار کو گھور کر دیکھا۔ اور اپنی ٹولی کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے لشکر کو روانہ ہوئے — "بڑا آیا ہے روکنے والا پھر روکا کیوں نہیں۔ جلا کر بھسم نہ کر ڈالتا۔ پورب پچھم سب ہمیں جانتا ہے"۔

اب قاضی صاحب نے چمٹے پر بھجن گانا شروع کیا :-

"سیں یہ سنسار بھائی رے، سیں یہ سنسار
سیں ماتا سیں پتا، سیں گورو دوار
سیں گھوڑا سیں ہاتھی، سیں اور ناد
سیں راجا، سیں پرجا، سیں سب بیوپار"

قاضی صاحب بمشکل چند ہی قدم چلے تھے کہ آگے دیورائے کا سیناپتی زرہ بکتر لگائے، چار آئینہ سجائے، سر سے پاؤں تک ادپچی بنا گھوڑے پر سوار نظر آیا۔ ایک رسالہ ساتھ لئے سینا کو دیکھتا پھرتا تھا۔ قاضی نے پھر زور سے نعرہ لگایا۔ "الکھ نرنجن......"

سیناپتی نے گھوڑے پر سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کہا: "مہاراج

آپ کرشنا پار سے آ رہے ہیں، کچھ پتہ ہے، ملیکھشوں کا سلطان کتنی سپاہ سے چڑھ کر آیا ہے؟"

قاضی نے آنکھیں چار کرتے ہوئے کہا:۔

"سیناپتی جی! ہم ساُدھو لوگ ہیں، اِن باتوں سے ہمارا کیا واسطہ، اگر ایک دُوسرے کی جاسوسی کرنے لگیں تو پھر ہمیں اپنے ملک سے کون گزرنے دے؟"

سیناپتی کچھ ایسے مرعوب ہوئے کہ پھر بول نہ سکے۔ ساُدھو اسی طرح چمٹے بجاتے اور بھجن گاتے خیمہ سے صدا کرتے چلے جاتے تھے کہ ایک جگہ سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ بڑھ کر دیکھا تو عجب عالم نظر آیا۔ خیمہ میں غالیچہ پر "وجے نگر" کی حسینہ کلاونتی بصد عشوہ و ناز ستار بجانے میں مصروف تھی اس کی موٹی موٹی سیاہ چمکیلی آنکھیں، کمان کی مانند تنی ہوئی بھویں، دراز پلکیں، گھنگھریالے بال، پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ، سفید موتیوں ایسے ننھے ننھے دانت، عطر بیز کالی زلفیں غضب ڈھا رہی تھیں۔ قاضی کچھ دیر ٹھٹکا، مگر پھر کچھ سوچ کر دفعتہً خیمہ میں گھس گیا اور بے تابی سے حسینہ کے پاؤں چومنے لگا۔

کلاونتی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ بولی:۔

"باباجی! آپ یہ کیا غضب کرتے ہیں؟"

بولا:۔ "اے جانِ جہاں! عرصہ گزرا، خواب میں تیری دلفریب اور

من موہنی شکل دیکھی تھی۔ اُس وقت سے یہ حالت ہے کہ نہ رات کو چین ہے نہ دن کو قرار۔ قریہ قریہ تیری تلاش میں پھرتا تھا کہ آج پورے چار سال کے بعد بھگوان نے تیرا درشن کرایا۔"

یہ کہہ کر قاضی نے اپنی گودڑی میں ہاتھ ڈالا، اور جواہرات و اشرفیوں سے بھری ہوئی دو تھیلیاں نکال کر اس کے قدموں پر نچھاور کر دیں۔

پہلے تو کلاونتی ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ جب اس قدر دولت دیکھی تو نرم ہو گئی۔ اُس نے اپنے نیم عریاں اور پُر مست شباب جسم کو لچکاتے ہوئے صراحی میں سے شراب اُلٹی اور قاضی کو چھلکتا ہوا جام پیش کیا۔ کہا:-

"سوم رس ہے پی لیجئے!"

قاضی نے پیالہ ایک جانب کو رکھ دیا۔ اور کہا:- "میں تو اس امرت کا پیاسا ہوں، جو تیری نشہ بار متوالی آنکھوں میں چھلک رہا ہے۔ "سوم رس" کا نشہ عارضی ہے، مگر نشیلی نگاہوں کی مستی دائمی اور ابدی ہے۔"

یہ کہہ کر بے تکلف حسینہ کے پہلو میں جا بیٹھا۔ کلاونتی کی آنکھیں جواہرات کی جگمگاہٹ سے چندھیا گئی تھیں۔ اُس نے قاضی کی تراش خراش سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اُس نے اپنی مرمریں باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور بولی:-

"سائیں جی! اتنی دولت کہاں سے اکٹھی کی؟"

"یہ دولت ......!" قاضی کے لبوں پر ایک نفرت انگیز تبسّم پھیل گیا ...."سندری! تیرا یہ پجاری کاشی کے ایک بڑے جوہری کا اکلوتا لڑکا ہے۔ اس نے گولکنڈہ کی کانیں ٹھیکہ پر لے رکھی ہیں، وہاں جواہرات گِنے نہیں جاتے، ہر سال تراشیدہ جواہرات کی ہزاروں بوریاں دساور کو جاتی ہیں جب میں تیری تلاش میں نکلا، بوڑھے باپ نے یہ دو تھیلیاں ہمراہ کر دیں کہ شاید سفر میں کام آئیں۔ مگر سادھوؤں کا روپے پیسے سے کیا کام! جب یہ صورت اختیار کی تو پھر ضرورت ہی نہ پڑی۔ ساتوں رفیق سفر ہی میں نصیب ہوئے، اور ان کی صحبت میں رات دن بسر کرتا شرینگ کی یاترا کو جاتا تھا کہ راستے میں دُرِ مقصود ہاتھ آ گیا۔"

کلاونتی نے پہلی بار محسوس کیا کہ دنیا میں اس کے سچے طلبگار بھی ہیں۔ اس کے نازک نازک نتھنے اوپر نیچے پھڑکنے لگے۔ اس کے دل و دماغ کی تہوں میں کیف و سرور کی موجیں لہرانے لگیں۔ بولی :-

"مہاراج! یہ بڑی دیا ہے کہ اس لونڈی پر اتنا کرم فرمایا یہ آپ کا گھر ہے، چشمِ روشن دلِ ماشاد! مگر اس وقت اجازت دیجئے۔ رات کو مجھے یوراج کے دربار میں ناچنا ہے۔"

قاضی نے لپک کر پکڑ لیا اور کہا :- "کئی سال کی خاک چھاننے کے بعد بمشکل آج تجھے پایا ہے۔ اب تو میں کسی طرح نہ جانے دوں گا۔"

حسینہ نے فتنہ در آغوش نگاہوں سے اپنے مجنوں کو دیکھا، اور شیریں آواز میں بولی :-

"مہاراج، گھبرائیے نہیں، میں جلد لوٹ آؤں گی!"

قاضی حسینہ کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا اور بولا :-

"اے بُتِ جفا کار! اتنی دولت ملنے پر بھی حرص کی آنکھ سیر نہیں ہوئی کہ چاندی کے چند سکّوں کی خاطر اپنے پریمی کو ہجر و فراق میں تڑپتا چھوڑ کر راجہ کے دربار میں جانا چاہتی ہے"

حسینہ بولی :- "مہاراج! آپ راج کمار کو نہیں جانتے، وہ بڑا پاپی اور ظالم شخص ہے۔ اگر میں، آج رات اُس کے دربار میں حاضر نہ ہوئی تو کل، وہ مجھے مروا کر چیلوں اور کتوں کے آگے پھنکوا دے گا"

"اگر تو جانے کے لئے اس قدر مجبور ہے تو پھر ہمیں بھی ہمراہ لے چل!" قاضی نے حسینہ کے گورے گورے نازک ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! یہ اس سے بھی مشکل بات ہے۔ راجہ کے دربار میں صرف وہی جا سکتے ہیں جو گانا بجانا جانتے ہوں، مگر آپ تو اس فن سے بے بہرہ ہیں!"

"اے پری شمائل! اگرچہ میں پہلے اس نعمت سے قطعی بے بہرہ تھا، مگر

جب سے تیرا دیدار کیا ہے۔ تیرے عشق نے خود بخود اس فن سے بہرہ ور کر دیا ہے۔ اگر تو مجھے ہمراہ لے جائے تو نہ صرف گا کر راجہ کو خوش کروں گا بلکہ بعض ایسے کرتب دکھاؤں گا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں گے!"

حسینہ نے مسکرا کر مندل پیش کیا اور کہا :۔

"اگر واقعی آپ کو گانا آتا ہے تو اس سے شوق فرمایئے!"

قاضی نے مندل اٹھا کر اس پر اس طرح سے دھرپد خیال ٹپا گایا کہ کبھی اس کے وہم و گمان بھی نہ آیا تھا۔ قاضی نے راگ ختم کیا ہی تھا کہ حسینہ وفورِ کیف سے بے تاب ہو کر اس سے چمٹ گئی، اور اپنے حُسن و شباب کی فسُوں کاریوں اور دل آویزیوں کا کمند پھینکتے ہوئے بولی :۔

"اے جگت گرو! مجھے یہ گمان تک نہ تھا کہ تم اتنے بڑے راگی ہو۔ اب تم بے تکلّف میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ تمہاری وجہ سے کلاونتی کا نام زیادہ چمکے گا!"

راجکمار وجے نگر نے ایک بڑے خیمہ میں جشن ترتیب دے رکھا تھا۔ ریشمیں پردوں پر چاروں طرف سُنہری اور روپہلی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ ہر طرف شمعیں اور قندیلیں روشن تھیں۔ اگربتیوں اور عود و عنبر کی خوشبو سے دربار مہک رہا تھا۔ کنہری سپاہی ننگی تلواریں لئے چاروں

طرف پہرے پر استادہ تھے، خیمہ کے درمیان میں آبنوس کے مرصّع اور جواہر نگار تخت پر وجے نگر کا حسین وجمیل راجکمار بڑی شان و شوکت اور جاہ وجلال سے بیٹھا دادِ عیش دے رہا تھا۔ دائیں بائیں دُور تک رنگین مزاج مصاحب پر اجمائے شراب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب نے سروں پر کامگار دوپٹے اور گلے میں جڑاؤ مالائیں پہن رکھی تھیں۔

تین گھڑی رات گزری تھی کہ دربار میں دُنیا بھر کے باکمال مطربوں اور مغنّیوں کی حاضری شروع ہوئی، میر نشاط جس کا نام لیتا وہ بجلی کی طرح تڑپ کر سٹیج پر رقص میں مصروف ہو جاتا۔ راگی باری باری اپنے رقص کا کمال دکھانے لگے۔ ہر طرف سے واہ واہ کا غُل برپا ہو گیا۔ ٹھاکر اور درباری امرا کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ دفعتہً میر نشاط نے پکارا:۔

"کلاونتی!"

ابھی یہ صدا فضا میں لہرا رہی تھی کہ وجے نگر کی حسین رقاصہ شعلہ جوالا کی طرح اُچھل کر رقص گاہ میں ناچنے لگی۔ اس کی نشہ میں ڈوبی ہوئی مدبھری آنکھیں، متبسّم لب، نیم عریاں رانیں، گداز جسم، متناسب اعضا، تماشائیوں کی پیاسی آنکھوں میں کھبے جا رہے تھے۔ اپنی مرمریں باہنوں کو پیچ وخم دے کر گورے گورے نازک بدن کو لچکا لچکا کر اس نے وہ رنگ جمایا کہ اندر کا دربار بھی ماند پڑ گیا۔ راجکمار سیاہ تخت پر کالے ناگ کی طرح مستی

کے عالم میں بیٹھا جھوم رہا تھا۔ اور ٹھاکر تو اس طرح مبہوت ہو رہے تھے گویا رقاصہ کے فنّی کمال نے ان کی تمام ذہنی قوتیں سلب کر لی تھیں۔

کلاونتی کے بعد قاضی سٹیج پر نمودار ہوا، اُس نے مخصوص انداز میں ستار بجانا شروع کیا۔ ساز میں سوز بھی تھا اور سرور بھی۔ ایک وقت اُس سے ایسی سُریں پیدا ہوتیں کہ دل ڈوبنے لگ جاتا اور ایسا محسوس ہوتا گویا دل پر آرے چلائے جا رہے ہیں۔ پھر تھوڑی سی تبدیلی سے ایسا سماں بندھتا کہ سامعین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اب قاضی نے کھنکھارا۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ گویا راگی گانا چاہتا ہے۔ سب اہلِ دربار ہمہ تن گوش ہو بیٹھے۔ قاضی نے بڑے سوز سے گانا شروع کیا۔؎

رنگا لے چنریا گندا لے ری سیس
تُو کیا کیا کرے گی اری دن کے دن
نہ جانے بُلا لے پیا کس گھڑی؟
کھڑی مُنہ تکے گی اری ایک دِن

بڑے بڑے ٹھاکر جو شراب پی پی کر مدہوش ہو رہے تھے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور بے اختیار ان کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو ٹپک پڑے۔ اس کے بعد قاضی نے مسخروں کا روپ بدلا اور بھانڈوں کی طرح کرتب دکھانے لگا۔ مندل نوازی اور کھیل تماشے سے اہل دربار کو اس طرح محظوظ کیا کہ

خیمہ تالیوں سے گونج اُٹھا۔

راجکمار کے ہونٹوں پر تبسّم کھیل رہا تھا اور اس کی موٹی موٹی آنکھیں وفورِ مسرّت سے چمک رہی تھیں۔ خادمائیں اس قدر کھوئی جاچکی تھیں کہ بجائے راجکمار کے اپنے آپ کو پنکھے جھل رہی تھیں۔ قاضی نے جب اہلِ دربار کو اس طرح بدمست دیکھا تو اُس نے ننگی کٹار ہاتھ میں لے کر ناچنا شروع کیا اس کا چیلا بھی کٹار لے مقابلے پر نکل آیا۔ دونوں نے تلواروں سے لڑنا شروع کیا۔ کچھ دیر تک یہ لوگ شمشیر زنی کے کمالات دکھاتے رہے پھر ناچتے کودتے راجکمار کے قریب پہنچے اور کچھ دیر رقص کرنے کے بعد یکایک اس چستی اور چابک دستی سے راجکمار پر حملہ کیا کہ کٹاریں سینہ کو چیرتی ہوئی پار نکل گئیں اس کا کام تمام کر کے دوسروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ ٹھاکر اور درباری امراء جو شراب کے نشے میں ہوش و خرد کھو چکے تھے، تلواریں نکال لڑنے کو اُٹھے مگر لڑکھڑا کر گر گئے۔ پانچ ملنگ جو باہر گوش بر آواز کھڑے تھے شور سُنتے ہی پردہ پھاڑ اندر گھس آئے اور سب نے مل کر دشمنوں کو گاجر مُولی کی طرح کاٹنا شروع کیا۔ جب نامی گرامی امراء کا خاتمہ کر چکے تو چراغ اور مشعل بجھا جس سوراخ سے آئے تھے اُسی راستہ سے باہر نکل گئے۔

کنہریوں کا لشکر میلوں کی مسافت میں پھیلا پڑا تھا سب اپنے اپنے خیمے میں بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ جوں ہی خیمۂ شاہی سے غلغلہ بلند ہُوا

گھبرا گئے۔ کسی نے کہا بلبچھول کا سلطان دس بارہ ہزار سواروں سے کرشنا کو عبور کر آیا ہے اور اُس نے راجہ اور راجکمار کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ کوئی کہتا کہ مسلمان لشکر شاہی سے جدا ہو کر کسی دُوسرے گھاٹ سے گزر آئے ہیں اور انہوں نے ہی شب خون مارا ہے۔ الغرض جتنے مُنہ اتنی باتیں رات اتنی اندھیری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ پڑے باتیں بناتے رہے مگر کوئی باہر نہ نکلا۔

(۴)

کوئی آدھی رات کا عمل تھا۔ سلطان فیروز اپنے خیمے میں مصلّے پر بیٹھا خدا کی جناب میں قاضی صاحب اور اُس کے رفیقوں کی فتح و نصرت کے لیے دُعا مانگ رہا تھا کہ اچانک شور سُنائی دیا۔ بادشاہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا ہنگامہ بتا رہا تھا کہ جس واقعہ کا انتظار تھا وقوع میں آ چکا، فوراً موگری اُٹھا کر گھڑیال پر ماری۔ آواز کے ساتھ ہی چوبدار حاضر ہُوا۔

"سپہ سالار کو حاضر کرو"۔ سلطان نے للکار کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد احمد خاں خیمے میں داخل ہُوا۔ بادشاہ دریا کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پا کر بولا:۔

"احمد خاں! سگنل ہو گیا۔ وہ دیکھو، پہاڑ پر آگ جل رہی ہے"۔

"جی ہاں، قاضی صاحب مقصد میں کامیاب ہو گئے!"

" تو پھر دیر مت کرو۔ پانچ ہزار چابکدست جاں باز ہمراہ لے فی الفور دریا میں کود پڑو۔ مابدولت بہت جلد پہنچنے کی کوشش کریں گے!"

" بہتر عالم پناہ!"

یہ کہہ کر احمد خاں باہر نکلا۔ فوج پہلے سے تیار کھڑی تھی چار ہزار گھوڑے زیر بند کاٹ کر دریا میں چھوڑ دیئے۔ اور اسی قدر جنگ آزما مجاہد چرمی ٹوکروں میں بیٹھ دریا کو عبور کرنے لگے۔

کرشنا کالے پہاڑوں میں چاندی کی طرح چمک رہا تھا اور اس کی مہیب طوفانی موجیں پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر شورِ محشر بپا کر رہی تھیں معلوم ایسا ہوتا تھا کہ دیو لڑ رہے ہیں۔ دو گھنٹے کی جرأت آزما کشمکش کے بعد غازیانِ اسلام کنارے پر جا پہنچے۔ ابھی رات کا پچھلا پہر رہتا تھا۔ مشرق سے چاند روپہلی رتھ پر سوار ہو کر دنیا کو منوّر کرنے کے لیئے برآمد ہوا۔ پہرے دار جو ساحلِ دریا پر ہوشیاری اور حفاظت کے لیئے مامور تھے، بادشاہی لشکر سے خائف ہو کر بھاگ گئے۔ فیروز مند لشکر نے کنہریوں کو نوکِ سناں پر دھر لیا۔ دیو رائے کو جب اپنے راجکمار کے قتل ہونے کا علم ہوا تو جہان اس کی نگاہوں میں تیرہ و تار ہو گیا روتا پیٹتا اپنے بیٹے کے ویران دیوان خانے میں آیا۔ مشعل کی روشنی میں اپنے فرزندِ جگر بند کی لاش پہچان کر دھاروں دھار رو دیا۔ ملازموں نے حاضر ہو کر

عرض کی کہ سلطان کا لشکر ادھر کو آرہا ہے۔ دیو دلائے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بے تحاشا لاش اُٹھا وجے نگر کو بھاگ اُٹھا۔ ابھی نیّرِ اعظم طلوع نہیں ہوا تھا کہ خورشید کلاہ، اقبال مند سلطان نے کرشنا کے مہیب دریا کو عبور کر کے ساحل پر قدم رکھا۔ قاضی صاحب، بہروپیوں کے لباس میں حاضر ہوئے اور کہا کہ سلطان کا اقبال بلند، دُشمن بُری طرح بد حواس ہو کر بھاگم بھاگ وجے نگر کو جا رہا ہے۔ اس کا سارا لشکر کئی میلوں تک بے ترتیبی سے پڑا ہے۔ اگر پُوری طاقت سے حملہ کیا جائے تو فتح یقینی ہے۔

قدر دان بادشاہ نے فرطِ محبت سے قاضی صاحب کو گلے سے لگا لیا، اور فرمایا —— "زود بینی کہ ترا نہال خواہم کرد" —— پھر کرنا ہاتھ میں لے زور سے پھُونکی، اور للکار کر کہا:۔

"مردان بکوشید تا جامۂ زنان نپوشید"

ۓ ہمارے علماء اور مشائخ کو اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ ان کا کام حجرے میں تسبیح و تہلیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اگر ضرورت پڑے تو انہیں عبا و قبا اور عمامہ و جریب پھینک یمانی تلوار ہاتھ میں لے میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت بھی دینی چاہیئے۔ زمانے کا مؤرخ "سراج الحق" کی جاں بازی کو اس طرح سراہتا ہے

جواں مرد قاضی چوں غرّندہ شیر | سوئے رائے زادہ در آمد دلیر
درا کشت و بر دیگراں حملہ کرد | دمار از ہنوداں بر آورد گرد

ادھر سورج کا خُون میں نہایا ہُوا رتھ مشرق کے سر بفلک سیاہ پہاڑوں سے نمودار ہُوا، اُدھر جنگ کا سُرخ پھریرا ہَوا میں لہرایا۔ نقّارے پر چوٹ پڑی اور گلبرگہ کا سلطان سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، مُشکی گھوڑے پر سوار، چتر لگائے اصفہانی تلوار علَم کئے بڑے جوش کے ساتھ دُشمنوں پر حملہ آور ہُوا۔ وجے نگر کا سیناپتی مقابلے میں جم نہ سکا، اور شکست کا داغ ماتھے پر لگا اِس طرح بھاگا کہ راجدھانی میں جا کر دم لیا۔ لشکرِ سلطانی نے بیجانگر کے اطراف تک تعاقب کیا۔ ہزاروں کنہریوں کو تہِ تیغ کر دیا۔ دُشمن بدحواسی میں اس قدر سامان چھوڑ گیا تھا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا خیمے، ڈیرے، شامیانے، سراپردے، دیبائے رومی، اطلس فرنگی، فرش و فروش کے علاوہ سپاہیوں نے زخمیوں کی کمروں اور مُردوں کی ہمانیوں سے جو طلائی اور نقرئی مہریں نکالیں اُن کا تو کچھ حساب ہی نہ تھا۔

لعل کی چوری

"اے آسمان کے بادشاہ! تُو دیکھ رہا ہے۔ میں بادشاہِ ہند کے دربار میں دادخواہی کے لئے جا رہی ہوں۔ اگر شہنشاہ نے میرا انصاف نہ کیا تو اس کا بدلہ تجھے لینا ہو گا!"

بیناؔ

آج سے پانچ سو سال قبل جب اعظم السلاطین سکندر لودھی گوالیار کے فلک بوس اور عجوبۂ روزگار قلعہ کو مسخّر کرنے کے بعد اس کے ضبط و نسق میں مصروف تھے۔ اس قلعہ کے نشیب میں مزدوری پیشہ لوگوں کی ایک بستی آباد تھی۔ جن میں شامو اور پہاڑی دو بھائی رہتے تھے۔

پہاڑی شامو سے پانچ برس چھوٹا تھا۔ دونوں سگے بھائی تھے اور آپس میں خوب نبھ رہی تھی۔ دونوں صبح کا ناشتہ کر کے ہمسایوں کے ساتھ پہاڑ کی چکر دار سڑک کو طے کرتے ہوئے شہر میں پہنچتے اور دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد اپنا نصیبہ لے شام کو گھر لوٹ آتے۔

محرم ۹۱۳ھ میں دفعتہً سلطان کے قشونِ قاہرہ کے کوچ کا اعلان ہوا، اور لشکری اپنے اپنے ہتھیاروں کو درست کرنے لگے۔ بازاروں میں اچھی خاصی رونق ہو گئی۔ جہاں کہیں دو چار آدمی جمع ہوتے یہی چرچا شروع ہو جاتا۔

پہاڑی ایک تنومند نوجوان تھا۔ اور بستی میں چلبلے پن کی وجہ سے مشہور تھا۔ اکھاڑے کی اس کے دم سے رونق تھی۔ وہ فطرتاً دلیر واقع ہوا تھا۔ سپاہیوں کی زبانی جب وہ جنگ و جدل اور لوٹ مار کے قصّے سنتا تو اس کی شریانوں میں بہادری کا خون کھول اُٹھتا اور وہ دِل ہی دل میں اپنے اِس ذلیل پیشے سے نفرت کرنے لگتا۔ گھر آتا تو کہتا:۔

"بھیّا! روز روز کی یہ مزدوری ہم سے نہیں ہو سکتی۔ ہم تو جنگ پر جائیں گے!"

شامو کہتا:۔

"نہ بھائی، لڑائی پر جانا ہمارا کام نہیں۔ ہم تم تو پتھر ڈھونے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اگر جنگ پر چند پیسوں کے ملنے کی اُمید ہے تو قدم قدم پر جان کا خطرہ بھی ہے۔"

لیکن پہاڑی پر جو نشہ چڑھ چکا تھا، شامو کے سمجھانے بُجھانے سے نہ اُترا، اور وہ اپنے ارادے پر نہایت مستقل مزاجی سے ڈٹا رہا!

---

۱۵ محرم کو جب شامو اور پہاڑی دوپہر کا کھانا کپڑے میں باندھے پہاڑ کی چڑھائی کاٹ رہے تھے۔ اچانک قلعہ کے نوبت خانے سے نفیریوں اور قرناؤں کے بجنے کی آواز آئی اور توپوں کی دنادن سے

قلعہ کی فضا گونج اُٹھی۔ دونوں بھائی چلتے چلتے رُک گئے، اور غور سے قلعہ کی طرف دیکھنے لگے۔

قلعہ کا فلک رفعت دروازہ بصد شان وشکوہ اتنے بُعد کے باوجود اس قدر صاف نظر آرہا تھا، گویا اس کے قدموں میں کھڑے دیکھ رہے ہیں شہنائیوں اور دماموں کی آواز مسلسل آرہی تھی اور جنگی سازوں نے وہ سماں باندھ رکھا تھا کہ جوش اور بہادری کا لہو دلوں میں کھولنے لگتا۔ اس ہنگامہ کے ساتھ ساتھ قلعہ کا دروازہ کھُلا اور ایک کوہ پیکر ہاتھی نکلا۔ جس پر اژدھا کی شکل کا شاہی نشان ہَوا میں فراٹے لے رہا تھا۔ اس کے پیچھے اور ہاتھی نمودار ہوئے۔ ان پر لودھی سلاطین کے مخصوص طبل و علَم اور سلطنتِ ہند کا ماہی مراتب آفتاب کی سنہری کرنوں میں اپنے انعکاسی عمل سے عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ پیچھے چند اور ہاتھی آئے ان پر برنجی اور فولادی نقارے اور دمامے لدے تھے۔ نقارچی فاتحانہ دھریت بجا رہے تھے۔ شامو نے حیران ہو کر پہاڑی کو دیکھا اور کہا:۔

" پہاڑی! ذرا انصاف سے کہنا۔ تمہاری نگاہوں نے کبھی پہلے بھی اتنا سامان دیکھا ہے؟"

" ہاں بھیّا! سکندر کی سینا ہے کوئی مذاق نہیں!"

اتنے میں فوج کے ہاتھی اُن کے پاس سے گزرنے لگے۔ جب نوبت

خانے کے ہاتھی گزر چکے تو ان کے بعد کئی ہزار ہاتھی عماری اور ہودج سے آراستہ، گلے میں ہیکلیں لٹکائے سونڈوں میں فولادی زنجیر لئے عجیب آن بان اور شان وشوکت سے ان کے قریب آئے۔ ہاتھیوں کے بعد سلطان کی سواری نہایت تزک و احتشام سے گزری۔ بادشاہ پیگو کے سفید ہاتھی پر عجب تمکنت سے سوار تھا اور پیچھے پیچھے وزیرِ اعظم اور دیگر اراکینِ دربار کے ہاتھی جھومتے جھامتے چلے آتے تھے۔ عقب میں ہزاروں سوار اپنے گھوڑوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پیادوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پہاڑی کا دِل قابو میں نہ رہا اور بولا:۔

"بھیّا! میں تو جاتا ہوں"

خدا معلوم، شامو کو کیا سوجھی کہ وہ بھی جنگ پر جانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ دونوں لپک کر گھر پہنچے۔ اور معمولی زادِ راہ ہمراہ لے، پیادوں کے ساتھ چل دیئے۔

سکندری اقبال سے پہاڑ بھی ذرّے بن کر اُڑ گئے۔ رہنونت گڈھ کی سنگین دیواروں کی کیا حقیقت تھی۔ سکندری جاں بازوں نے تلواریں نیام سے نکال، جان کی بازی لگا، قلعے پر ہلّہ بول دیا اور جو مہم مجاہد خاں کی بددیانتی سے چھ ماہ کے طویل عرصہ میں سر نہ ہو سکی تھی، شہنشاہ کے

قشونِ قاہرہ نے ایک ہی حملہ میں جیت لی۔ اور ہنومنت گڈھ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ عین اس وقت جبکہ شاہی فوج شہر کے لوٹنے میں مصروف تھی۔ شامو اور پہاڑی نے بھی دار و گیر کے اس ہنگامہ میں ایک سیٹھ کے مکان پر چھاپہ مارا۔ اور چوہوں کی طرح دبے پاؤں اشرفیوں کی چند تھیلیاں اور چند ریشمی پارچات اُڑا آنکھ بچا کر باہر نکل آئے۔ دونوں دیر تک چُپ چاپ چلتے رہے۔ جب پُرانے کھنڈر کے پاس پہنچے تو ایک شکستہ دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گئے۔ پہاڑی نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا:۔

"لو بھئی، جو کچھ ملا ہے اسے یہیں بانٹ لیں!"

شامو نے پتھر کی ایک بڑی سِل پر تھیلیوں کو اُلٹ دیا۔ اشرفیوں کی جگمگاہٹ سے کھنڈر بھی چمک اُٹھا۔ پہاڑی نے اشرفیوں کو انگلیوں سے کریدا۔ دو لعل بے بہا جگمگ جگمگ کرتے نکل آئے۔— دونوں بھائیوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ شامو نے فوراً دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ دیا۔ اور پہاڑی کو کہنی مارتے ہوئے آہستگی سے کہا، ہماری قسمت جاگ اُٹھی۔ دونوں قیمتی لعل معلوم ہوتے ہیں۔ چھپا لو اِن کو! ممکن ہے ہماری طرح کوئی اور بھی اس کھنڈر میں موجود ہو!

پہاڑی نے جلدی سے اشرفیوں کے دو حصے کر ڈالے۔ شامو نے

ایک حصّہ اُٹھا کر تھیلی میں ڈال لیا اور اپنے حصّے کا ایک لعل بھی لے لیا۔ دونوں نے تھیلیوں کو کس کر کمر سے باندھ لیا اور واپس کیمپ کو روانہ ہوئے۔ پہاڑی نے کہا:۔

"شامُو بھائی! ہماری زندگی کے لئے اتنا کچھ کافی ہے، چلو، اب وطن کو لَوٹ چلیں اور باقی زندگی عیش و آرام سے بسر کریں!"

شاؔمو نے ایک زہر خند قہقہہ لگایا اور کہا:۔

"بس، اِسی لئے مجھے تنگ کرتے تھے۔ اب اگر آچکے ہو تو چندے اور فوج میں رہ کر اپنی بہادری کے جوہر دکھاؤ۔ کیا عجب کہ سُلطان کی نظر پڑ جائے اور تمہیں کسی اچھے عہدے پر لگا دے"۔

"نہ بھائی، مجھے اتنا کافی ہے۔ زیادہ حرص آدمی کو خراب کرتی ہے میں تو اب گھر جاؤں گا۔ گوالیار کا پر شکوہ قلعہ، حسین پہاڑی، لاڈو اور نندُو کی دوستی، اور سب سے بڑھ کر اپنا وہ پیارا پیارا جھونپڑا۔ کیا یہ کوئی بُھلانے کی چیزیں ہیں!"

جس وقت شاؔمو نے دیکھا کہ پہاڑی واپس جانے پر مُصر ہے تو اُس نے اور اصرار مناسب نہ سمجھا اور اپنا مال بھی اس کے حوالے کیا اور کہا کہ "یہ چیزیں میرے گھر میں دے دینا!"

دونوں بھائی ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر ملے۔ شاؔمو نے بال

بچوں کی خبر گیری اور گھر کی نگرانی وغیرہ کی ہدایت کر کے پہاڑی کو رخصت کر دیا۔

شامو دو برس تک افواجِ شاہی کے ساتھ ساتھ لکھنوتی کے اطراف میں پھرتا رہا۔ لیکن چونکہ حملے سے پہلے راجے مہاراجے سلطان کی اطاعت کر لیتے تھے۔ اس لئے کسی جگہ بھی لُوٹ مار کی اجازت نہ ملی۔ اس لئے شامو معمولی سامان کے ساتھ گوالیار کو واپس ہُوا اور آتے ہی بیوی بچوں سے اپنی امانت کا مطالبہ کیا۔

بینا شامو کی نیک بخت بیوی تھی۔ اس غریب نے اتنا عرصہ نہایت کفایت شعاری سے گزارا تھا۔ اُس نے تفصیل سے بتایا کہ اتنے روپے بال بچوں کی خوراک پر خرچ ہوئے، اتنے کے ہم نے کپڑے خریدے، باقی یہ اشرفیاں جوں کی توں رکھی ہیں۔"

شامو نے فکر مند ہو کر کہا:-

"اچھا خیر، یہ تو درست ہُوا، مگر وہ لعل کہاں ہے؟"

"لعل کون سا؟ میں نے تو لعل وال کچھ نہیں دیکھا!" بینا نے گھبرا کر جواب دیا۔

شامو کی آنکھیں غصّہ سے لال پیلی ہو گئیں۔ وہ چمک کر بولا:-

"کیا پہاڑی نے تمہیں لعل نہیں دیا!"

"بالکل نہیں!"

شامو گھبرا اُٹھا۔ آواز دے کر بھائی کو بُلایا:۔

"پہاڑی بھیّا، پہاڑی بھیّا!!"

پہاڑی چُھری سے رسّی کاٹ رہا تھا۔ چُھری وہیں پھینک آہستہ آہستہ شامو کے پاس آیا۔

"میرا لعل کہاں ہے؟" شامو نے پریشانی کے عالم میں چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"لعل! وہ تو میں نے آتے ہی بھاوجہ کے حوالے کر دیا تھا!"

یہ سُن کر بینا باہر نکل آئی۔ اور سراسیمگی کی حالت میں بولی:۔

"پہاڑی بھیّا! کیا کہہ رہے ہو، لعل اور مجھے؟"

"اس وقت تو خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ اور ہر جگہ اُچھالتی پھرتی تھی۔ اب کہتی ہے کیسا لعل! گویا کچھ جانتی بھی نہیں!"

"ہائے بھگوان! اب میں کیا کروں!" شدّتِ غم سے بینا ٹھہر نہ سکی اور روتی ہوئی کوٹھری میں چلی گئی۔

شامو بےچارہ تذبذب میں تھا کہ پہاڑی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا:۔ "عورت ذات سے خدا بچائے۔ کس طرح مُنہ پر جھٹ مُکر گئی ہے

شامو بھائی! سیدھے ہاتھ کام نہ چلے گا۔ ذرا آنکھیں دکھاؤ۔ لعل گھر ہی میں ہے۔ کہاں جا سکتا ہے؟" یہ کہہ پھر چھُری لے، اپنے کام میں لگ گیا۔

بینا کمرے میں چارپائی پر پڑی سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ شامو نے اُسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ اور کہا:۔

"پرتھو کی ماں! ہزاروں لاکھوں کی چیز ہے۔ تمہارے رونے دھونے سے وہ ہضم نہیں ہو سکتی۔ بہتر ہے کہ واپس کر دو، ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا!"

بینا نے جب شوہر کے تیور بدلے دیکھے اور کوئی صورت بچاؤ کی نظر نہ آئی تو عورت ذات ہو کر مردانہ وار جواب دیا کہ

"رات کی مہلت دے دو، صبح کو حاضر کر دوں گی۔"

اِس پر معاملہ دُوسرے دن پر ملتوی ہو گیا۔

اُس رات بینا کو فکر سے ایک لحظہ بھی نیند نہ آئی۔ سوچتے سوچتے صبح کر دی اور بڑے سوچ بچار کے بعد اِس نتیجہ پر پہنچی کہ اس شر سے بچنے کے لئے عدالت کی پناہ پکڑنی چاہیئے۔ چنانچہ صبح سویرے ہاتھ مُنہ دھو، صاف ستھرا لباس پہن شہر کو روانہ ہو گئی!

سردی کا موسم، کہر چھائی ہوئی تھی، بدن ٹھٹھر رہا تھا۔ اکثر لوگ صبح کی نماز پڑھ کر گھروں کو لوٹ رہے تھے، اور کئی صبح کی سیر کے لئے گھروں سے نکل کر باہر جا رہے تھے۔ بینا اس عالم میں عدالتِ عالیہ کے برآمدے میں دبکی کھڑی تھی۔ ایک شریف آدمی پاس سے گزرا بینا نے گلوگیر آواز میں بلا کر پوچھا :-

" بھلے آدمی! تمہیں کچھ پتہ ہے کہ میرِ عدل (چیف جسٹس) کس وقت آتے ہیں؟"

" پہر دن کو !"

" میں نے ان سے ضروری ملنا تھا۔"

" تو پھر ان کے ہاں گھر میں چلی جاؤ۔ وہ بہت نیک آدمی ہیں، ہر شخص سے با اخلاق پیش آتے ہیں!"

" میں نے اُن کا گھر دیکھا ہوتا تو یہاں کیوں آتی!"

" وہ چوک کے دائیں طرف جو بڑا محل نظر آتا ہے۔ یہی گوالیار کے میرِ عدل میاں بھورا صاحب کا مکان ہے۔"

یہ سن کر بینا اُدھر کو روانہ ہوئی۔ اگرچہ دربانوں نے ٹوکا کہ یہ میاں صاحب کے اوراد و وظائف کا وقت ہے اگر وہ تیر کی طرح اندر چلی گئی۔ میاں بھورہ صاحب سفید ریش، پچاس برس کی عمر، مصلّے پر بیٹھے اوراد و

اذکار میں مصروف تھے۔ اسے دیکھ کر ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور فرمایا:۔

"ہوں ۔۔۔ !" یعنی حال بیان کرو۔

ستم رسیدہ بیناؔ نے سارا واقعہ من وعن بیان کیا۔ میاں صاحب نے وظائف سے فارغ ہو کر فوراً اپنا پیادہ دوڑایا کہ اُس کے شوہر اور دیور کو بلا کر عدالت میں حاضر کریں۔ بینا کو تسلی دی اور گھر میں اُس کے کھانے کا حکم دے کر عدالت کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

پہر دن چڑھے عدالت گاہ میں بیناؔ کی طلبی ہوئی۔ اسی اثنا میں شامو اور پہاڑی بھی آ گئے تھے۔ میاں بھوؔرہ نے فرداً فرداً بیناؔ، اور اس کے شوہر کے بیانات قلمبند کئے اور پھر پہاڑی سے سوالات کرنے شروع کئے۔ اُس نے ہر طرح سے عدالت کو تسلّی دلائی کہ وہ لعل اپنی بھاوجہ کو دے چکا ہے۔

میاں بھوؔرہ نے پوچھا۔ "اِس واقعہ کے گواہ ہیں؟"

"جی ہاں!"

"کتنے ۔۔۔؟"

"دو برہمن!"

"حاضر کرو!"

پہاڑی لپک کر قمار خانے میں پہنچا اور دو قمار باز برہمنوں کو کچھ دے دلا کر اپنی منشاء کے مطابق گواہی دینے پر رضامند کر لیا۔ چنانچہ وہ دونوں عدالت میں آئے اور حلفیہ بیان دیا کہ پہاڑی نے ہماری موجودگی میں ہی بینا کو لعل دیا تھا۔

میاں بھورہ نے بینا کی طرف مخاطب ہو کر کہا:-

"افسوس کہ عدالت تمہیں بے قصور ثابت نہیں کر سکتی۔"

شامو سے فرمایا کہ:-

"تم اپنی بیوی سے لعل حاصل کر سکتے ہو!"

حیرت سے بینا کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں اور دنیا اسے اندھیر معلوم ہونے لگی۔ ایک دل سوز آہ کھینچی اور مرتعش آواز سے کہا:-

"کیا آپ کا انصاف یہی ہے؟"

اور یہ کہہ کر دم بخود کمرے سے باہر نکل آئی۔

لوگوں نے جو اس موقعہ پہ عدالت گاہ سے باہر جمع ہو گئے تھے، بینا کو مشورہ دیا کہ خوش قسمتی سے سلطان آج کل یہیں ہے۔ اس کی بارگاہ میں جا کر فریاد کر، یقیناً انصاف ہو گا۔"

"ہاں میں اپنے دکھ کی فریاد شہنشاہ کے پاس لے کر جاؤں گی!"

بینا نے قلعے کا رخ کیا۔ اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر رقت

بھری آواز سے کہا :۔

"اے آسمان کے بادشاہ! تُو دیکھ رہا ہے۔ میں سلطانِ ہند کے دربار میں دادخواہی کے لئے جا رہی ہوں۔ اگر شہنشاہ نے میرا انصاف، نہ کیا تو اس بدلہ تجھے لینا ہوگا!"

بنّا بے دھڑک بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دیوانِ عام کا دروازہ آ گیا۔

اعظم السلاطین سکندر ثانی شہنشاہ ہند شاہانہ شوکت و اجلال سے تخت پر بیٹھا ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا۔ چوبدار نے داخل ہو کر عرض کی :۔

"عالم پناہ! ایک ہندو دیوی دروازے پر کھڑی ہے، اور باریابی کی اجازت چاہتی ہے۔"

"اُسے ہمارے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ہے!" سلطان نے نظر اُٹھا کر چوبدار سے خطاب کیا۔

چوبدار کورنش بجا لا کر باہر نکل گیا۔ چند لمحات کے بعد بنّا دربار میں داخل ہوئی۔ شرم و حیا سے نگاہیں زمین پر جم رہی تھیں، اور رعب شاہی سے قدم سو سو من کے ہو رہے تھے۔

سلطان نے بڑی نرمی سے فرمایا:۔ "بہن کہو، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں!"

"جہاں پناہ! میری زندگی خطرے میں ہے۔ میں مہاراج کی حمایت میں اپنی جان بچانے آئی ہوں ـــــ لوگوں سے سُنا ہے کہ آپ رعایا کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں!" یہ کہہ کر بینا زار و زار رونے لگی۔

سُلطان نے دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ کہا، مابدولت تمہاری درد بھری کہانی کو تفصیل سے سُننا چاہتے ہیں۔ بول تجھے کیا دُکھ پہنچا ہے؟"

بینا نے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ جواب دیا:۔

"عالم پناہ! دو سال کا عرصہ گزرا، میرے شوہر نے سفر سے میرے دیور کے ہاتھ لعل بھیجا کہ میرے گھر میں دے دینا۔ لیکن اُس نے بددیانتی کی۔ اور لعل، کا یہاں ذکر تک نہ کیا" ـــــ شدتِ غم سے بینا کے آنسو گرنے لگے۔ گلو گیر ہو کر بولی ـــــ "اب وہ مجھے چوری کا الزام دیتے ہیں اے بادشاہ تیرے راج میں مَیں مفت میں ماری جا رہی ہوں"۔

سلطان نے کہا:۔ "درست ہے، مگر تجھے ہمارے میرِ عدل میاں بھُورا کے حضور میں پیش ہونا چاہیے تھا!"

"میں وہاں حاضر ہوئی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ آپ کے میرِ عدل نے مجھ سے انصاف نہیں کیا۔ پہاڑی کے جھوٹے گواہوں کے فریب

میں اگر فیصلہ میرے خلاف کیا ہے۔ اے راجن! بتائیں لعل کہاں سے پیدا کروں، جبکہ میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں!"

سُلطان نے اُسی وقت حکم دیا کہ ہمارے میرِ عدل اور مظلومہ کے شوہر اور دیور کو دربار میں حاضر کیا جائے۔

ہرکارے دوڑے گئے۔ اور چشمِ زدن میں میرِ عدل، شامو، پہاڑی اور ان کے گواہوں کو دربار میں لا حاضر کیا۔ میاں بھورا کو تو بادشاہ نے تخت کے قریب جگہ دی اور افرادِ مقدمہ کے لئے حکم ہوا کہ باری باری طلبی پر پیش ہوں!

سب سے پہلے شامو طلب کیا گیا۔ جہاں پناہ نے تھوڑی سی موم اُس کے آگے رکھ دی۔ فرمایا:۔

"تم نے جو لعل پہاڑی کو گھر پہنچانے کے لئے دیا تھا۔ اس کی ہیئت بنا کر پیش کرو!"

شامو نے تھوڑی سی دیر میں لعل کی ہیئت تیار کر دی۔ پھر پہاڑی حاضر ہوا۔ اُس نے بھی اشارہ پا کر لعل کی شکل وصورت میں موم کو ڈھال کر پیش کیا۔ ان کے بعد دونوں برہمن طلب ہوئے۔ اُنہوں نے شاہی فرمان پر لعل تو بنائے، مگر بے ڈھنگے، شکلیں آپس میں ملتی نہ تھیں۔ بادشاہ نے ان کو بھی چھپا کر رکھ دیا۔ پھر بنیا پیش ہوئی۔

سُلطان نے اُسے بھی لعل بنانے کا حکم دیا۔ بینا نے دست بستہ عرض کی۔

"لونڈی نے جس چیز کو آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس کی شکل کیسے تیار کر سکتی ہے!"

"کیا تو لعل کی ہیئت تیار نہیں کر سکتی؟" سلطان نے ڈانٹ کر کہا۔

"میں کیسے بناؤں مہاراجن! میں نے تو اُسے دیکھا ہی نہیں۔ اگر اِن آنکھوں نے دیکھا ہو تو اندھی ہو جائیں، اگر میرے ہاتھوں نے اسے چھُوا ہو تو ان میں کیڑے پڑیں!"

"گواہ پیش ہوں!" سلطان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

دونوں پُجاری ڈرتے ڈرتے پیش ہوئے۔ سُلطان نے اُن پر غضب آلود نگاہوں سے نظر کی اور فرمایا:۔

"دیکھو! تم اپنے بادشاہ کے حضور میں پیش ہو جو خدا کی طرف سے تمہاری جان اور مال کا محافظ ہے۔ سچ سچ کہو، کیا معاملہ ہے، ورنہ ذلّت سے مارے جاؤ گے!"

برہمنوں پر رعب شاہی سے لرزہ طاری ہو گیا۔ زبان نے یاوری نہ کی، دائیں بائیں بغلیں جھانکنے لگے۔ سُلطان کی گرج سے دیوانِ عام گونج اُٹھا، چیخ کر کہا:۔

"بد بختو! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ابھی تک بادشاہ پر تمہاری سیہ کاری کا راز فاش نہیں ہوا؟ —— لو دیکھو ——!"

یہ کہہ کر سلطان نے لعل کی تمام ہیئتیں تخت کے روبرو رکھ دیں اور اہلِ دربار سے خطاب کر کے فرمایا:-

"حضرات! دیکھئے، یہ ہیئتیں شامو اور پہاڑی کی بنائی ہوئی ہیں آپس میں کس قدر مشابہت رکھتی ہیں! در اصل لعل کی یہ اصلی ہیئت ہے" —— پھر گواہوں کی بنائی ہوئی شکلیں پیش کر کے فرمایا "اب گواہوں کی بنائی ہوئی شکلیں دیکھئے۔ یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ لعل کس شکل و صورت کا ہوتا ہے۔ کہ یہ دونوں جھوٹے گواہ ہیں۔ اور پہاڑی نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے اُنہیں پیش کیا ہے۔"

سُلطان نے دوبارہ پہاڑی اور اس کے گواہوں پر آتش بار نظر ڈالی جس پر خوف سے ان پر سکتہ کی حالت طاری ہو گئی اور موت کا نقشہ، اُن کی نگاہوں میں پھرنے لگا۔ تینوں ملزم تخت کے آگے جُھک گئے، اور اپنے جُرم کا اعتراف کرتے ہوئے معافی کے طالب ہوئے، مگر اُن کی اِس درخواست نے بادشاہ کے دِل پر کچھ اثر نہ کیا۔ سُلطان نے اُنہیں گھُور کر دیکھا۔ کہا:-

"تمہیں معافی کیسے دی جا سکتی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ مظلومہ ہمارے

دربار تک نہ پہنچتی تو خدا معلوم اس کا ظالم شوہر اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا!"

فرمان ہوا کہ پہاڑی سے لعل حاصل کر کے شاموکو دلایا جائے اور اس بد دیانتی کے جرم میں اُسے دو سال اور گواہوں کو چھ چھ ماہ قید بامشقّت کی سزا دی جائے، پولیس نے اُسی وقت مجرموں کو اپنی حراست میں لے لیا۔ اور سلطان نے بینا کو محض اس خیال سے کہ میری سلطنت میں اسے مفت کی تکلیف ہوئی۔ قیمتی مال امرحمت کر کے ہمدردی اور دل سوزی سے رخصت کیا۔ میاں بھورہ کو ہدایت ہوئی کہ آئندہ مقدمہ کی کُنہ تک پہنچنے کے لئے کافی تدبّر اور تفکّر سے کام لیا کریں!

○

چاکرِ اعظم

شعبی اساطیر کا عظیم انسان

جس نے حق و انصاف کی خاطر تیس سال تک اپنے

ہی عزیزوں سے شدید جنگ لڑی

"اے مظلوم خاتون! تم اس مقام سے کُوچ کرو، اور سنّی
کی طرف چلی جاؤ۔ جب تک تیرا بدلہ نہ لے لوں، میرے
لئے گھر کا پانی پینا حرام ہے۔"

"چاکر اعظم"

والدِ ماجد کے انتقال کے بعد چاکر خاں، رِند بلوچوں کا سردار مقرر ہوا۔ اس وقت خانِ اعظم کا پایۂ تخت شورآن میں اور میر گواہرام کا گندآوہ میں تھا۔ چاکر خاں نے قلات ریاست پر قبضہ کر کے اپنے خسر میر مندو کو اس کا گورنر مقرر کیا۔ انہی ایام میں میر حسن جو میر شہک کے حقیقی بھائی اور چاکر اعظم کے عمّ بزرگوار تھے انتقال فرما گئے۔ انہیں ان کی وصیّت کے مطابق دریائے لاہڑی کے قریب پہاڑ کے دامن میں دفن کیا۔ یہ مقام معروف اور زیارت گاہِ خلائق ہے۔ میر حسن کے پانچ صاحبزادے تھے۔ میراں، جنید، ریحان، میر محمد خاں، میر براہیم خاں۔ اور یہ چاکر خاں کے دستِ راست تھے۔ کچھ عرصہ رند اور لاشار آپس میں پیار و محبّت سے زندگی بسر کرتے رہے۔ بعد میں سبزہ زاروں، وادیوں اور سرحدی امور بران کے مابین تلخیاں پیدا ہوتی چلی گئیں، بایں ہمہ ابھی تک ظاہرداری موجود تھی۔ میلوں ٹھیلوں میں دونوں قبائل کے بچّے، جوان اور بوڑھے

سب جمع ہو جاتے تھے۔ گھوڑ دوڑ اور کشتیوں کے مقابلوں میں حصہ لیتے اونٹوں، گھوڑوں کی خرید و فروخت ہوتی اور سبی کا میلہ جو موسمِ بہار میں بڑے اہتمام سے منعقد ہوتا تھا۔ ان دونوں قبائل کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ایک سال حسبِ معمول یہ میلہ بڑی شان سے منعقد ہوا، گھوڑ دوڑ کے لئے کافی شہسوار تیار تھے۔ لیکن میر ریحان رند، اور میر رامن لاشار کے مقابلے کا زیادہ چرچا تھا۔

دفعتہ نقارے پر چوٹ پڑی۔ دونوں سواروں نے باگیں اُٹھائیں اور میر ریحان آگے نکل گیا۔ میر رامن اپنی شکست سے بوکھلا اُٹھا۔ اُس نے کہا، میرے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ کسی شیطان نے میری گھوڑی کا تنگ ڈھیلا کر دیا تھا۔ میدان میں عام بھگدڑ مچ گئی اور لاشاری غم و غصہ سے پیچ و تاب کھاتے گھوڑے دوڑاتے میدان سے نکل کر چلے گئے۔

کچروک کے چشمے پر!

تیسرے دن صبح سویرے چاکر اعظم سیر کے لئے باہر نکلے۔ کچروک کے چشمے پر انہوں نے دیکھا کہ بے شمار اونٹنیاں بھاگی بھاگی پھر رہی ہیں اور ان کے پستانوں سے دُودھ ٹپک رہا ہے، میر چاکر خاں نے ایک چرواہے کو بلا کر اِس بارے میں سوال کیا۔ دفعتہ ایک خاتون

جو اس گلّے کی مالکہ تھی نمودار ہوئی۔ اس نے کہا۔

"میرے آقا! جانوروں میں وبا پھیل چکی ہے۔ اس لئے شتر بچے مرتے جا رہے ہیں۔ ماں کی ماری اونٹنیاں بے چین ہو کر ادھر اُدھر بھاگی پھرتی ہیں اور ان کا دودھ بے اختیار پستانوں سے ٹپک رہا ہے۔"

چاکرِ اعظم نے اس بی بی سے رنج و غم سے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور گھوڑے کو آگے بڑھایا۔ لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چپّے چپّے پر اس بی بی کے شُتر بچے کٹے پڑے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ انہیں تلوار سے ذبح کیا گیا ہے۔ میر چاکر نے ایک چرواہے کو پاس بُلا کر پُوچھا:

"سچ سچ بتاؤ کہ یہ کیا معاملہ ہے؟"

چرواہے نے دست بستہ عرض کی:۔

"میرے آقا! پرسوں چند لاشاری نوجوان گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے اور انہوں نے شتر بچوں کو ذبح کر ڈالا۔ حضور! پرسُوں سے یہ اونٹنیاں بے قرار پھرتی ہیں۔ بے چاری کل تک اپنے بچوں پر گری پڑی تھیں۔ ہم لوگ ڈنڈے مار مار کر یہاں سے ہٹا لے گئے۔ میری مالکن نے اصل واقعہ حضور کے آگے اس لئے نہیں رکھا کہ وہ حضُور کی غیرت سے اچھی طرح واقف ہے اور نہیں چاہتی کہ اُس کی وجہ سے خُون خرابہ ہو!

چاکر اعظم غم و غصہ پر قابو پاکر بولے :-

"اے مظلوم خاتون! تم اس مقام سے کوچ کرو! اور سبیؔ کی طرف چلی جاؤ۔ جب تک تیرا بدلہ نہ لے لوں، میرے لئے گھر کا پانی پینا حرام ہے"

میر چاکر نے فوراً اپنی فوج طلب کر لی جو علی الصبح گاجان اور اس کے نواحی علاقے پر حملہ آور ہوئی۔ اُس نے میر گوَاہرام کے ایک وگ کو ہلاک کر ڈالا۔ اور اونٹوں کے گلہ بان کا ایک بازو کاٹ دیا۔

وار کونسل

چاکر اعظم نے سبی پہنچ کر اپنے فوجی سرداروں کو طلب کیا اور کہا کہ طبلِ جنگ بج چکا ہے۔ اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ جام مندو نے کہا کہ قبیلے کی عورتوں کو "کوند" کے محفوظ پہاڑ میں پہنچا دینا چاہیئے، اور ہمیں یہ جنگ پہاڑوں اور چٹانوں میں لڑنی زیادہ مناسب ہے۔

بی برگ نے بھی اسی خیال کی تائید کی کہ اگر جنگ لڑنی ہے تو قلعے اور خیمے گرا دیں۔ نہری جائیداد اور مال و متاع کو چھوڑ دیں اور کسی محفوظ مقام کا تعیّن کریں۔

میر جاَن نے کہا۔ "ہم نہ پایۂ تخت چھوڑیں گے اور نہ میدانی علاقے ہمیں آنے والی نسلوں کے لئے انہیں محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اپنے پوتوں

کے لئے جو ہمارے بعد آئیں گے!

فوج طلب کر لی گئی۔ یہ تمام رند نسل سے تھے۔ سب کے سب سروں پر خود رکھے، ریشمی کوٹ اور گلو بند پہنے، گھوڑوں پر سوار تھے۔ اُنہوں نے سُرخ رنگ کے موزے پہن رکھے تھے۔ خنجروں کے دستے چاندی کے تھے۔ اُنگلی میں سونے کی انگوٹھی اور ہاتھ فولادی دستانوں میں چھپے ہوئے تھے۔ یہ لوگ تیر کمانوں اور حمائل سے لیس تھے۔ جنگ آزما بہادروں میں میر حاؔن، خدا پرست حدّہ، مشہور شہسوار ریحاؔن، تلوار کا (دھنی) پیروشاہ، میر بجاؔر، صوبہا میہن، علیؔ، جام سہاگؔ علنؔ، ہیبتاؔن، بی برگؔ، میر حسؔن اور میر ابراہیم جیسی نامور شخصیتیں شامل تھیں۔

ادھر میر گواہرام نے بھی ایک عظیم لشکر تیار کیا۔ وہ قبیلہ نوحانی کے ہاں گئے۔ عمر نوحانی نے ایک قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا کہ اس نے لاشاری لشکر کے لیے سترہ سو بیل، اٹھارہ سو دُنبے ذبح کئے اور ایک سو بیس من گندم کا آٹا مہمانی کے طور پر پیش کیا۔

میر چاکر کو لاشاریوں کے تازہ اقدام کا علم ہوا تو اس نے اپنے آدمی دشت بیاباں میں جاسوسی کے لیے روانہ کئے۔ انہوں نے واپس آکر کہا۔ ہم نے لاشاریوں کے سو گھرانوں کو ایک ساتھ کوچ کرتے دیکھا

ہے۔ رند خوش ہوئے اور ان کا لشکر حرکت میں آیا۔ اس موقع پر بیبرگ آگے بڑھا اور اس نے سردار کے گھوڑے کی لگام تھام لی اور کہا:۔

" اے چاکر! اپنی تلوار کو نیام میں کر لے۔ صرف نوحانیوں کی فوج ہزار جوانوں پر مشتمل ہے۔ اور سرخ میانوں والے لاشاری میدانِ جنگ کے ہیرو ہیں اور کفن سر سے باندھ چکے ہیں!"

چاکر اعظم نے کہا:۔

" یہ سب صحیح، لیکن مجھے اپنی رعایا کی نظروں میں ذلیل ہونا گوارا نہیں مجھے اپنے ناموس پر قربان ہونے سے نہ روکو!"

بی برگ نے کہا:۔

" اے سردار! اگر آپ نے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے، تو پھر اپنے ناقابلِ تسخیر قلعے میں بیٹھ کر دشمن کا مقابلہ کیجئے۔"

تب میرو جاڑو اور ریحان نے آگے بڑھ کر کہا:۔

" بیبرگ تیروں سے ڈرتا ہے، اسے ہندی تلواروں سے خوف آتا ہے۔ جب ہم اپنی تلواریں لڑائی کے لئے نکالیں گے تو اسے تیروں، اور تلواروں کی زد سے دور بٹھا دیں گے!"

یہ سنتے ہی بی برگ نے چاکر کے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی اور کہا:۔

" میں قوم کی باعصمت خواتین کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب تم سب آگے

میں میدانِ جنگ میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔"

چاکرِ اعظم نے گھوڑا آگے بڑھایا اور للکار کر کہا :-

" بہادرو آگے بڑھو اور دُشمن کو تہس نہس کر دو !"

دُوسری طرف سے میر گواہرام کی گرج سُنائی دی :-

" شاباش ، لاشاری بہادرو ! شاباش !! رند سردار میدانِ جنگ میں کُود پڑا ہے ، میں اس کے مقابلے کے لئے آگے بڑھتا ہوں !"

ہر دو اطراف سے جوش دلانے کے لئے ڈھول بجنے لگے ۔ پہلے ہر لشکر نے غنیم کی تیروں سے ضیافت کی ۔ ازاں بعد تلواریں نیام سے نکل پڑیں ، شدّت کی جنگ شروع ہو گئی ۔ رندوں کا مشہور سردار میر جاڑو مارا گیا ۔ ایک لاشاری نے میر حسن کو تاک کر ایسا تیر مارا کہ اُس نے سینے میں ترازو ہو کر رہ گیا ۔ وہ لڑھکا اور چک پھیری کھا کر زمین پر گر گیا ۔

دو بہادر رفیقوں کی موت نے چاکر اعظم کو برافروختہ کر دیا ۔ تیروں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھا اور چلّا کر بولا :-

" بہادرو ! جاڑو اور حسن کی روحیں تمہاری بہادری کا تماشا دیکھ رہی ہیں ، آگے بڑھو اور دُشمنوں کو کچل کر رکھ دو !"

رند بپھرے ہوئے شیر کی طرح آگے بڑھے ۔ علی رند نے تاک کر ایسا تیر مارا کہ گواہرام کے پہلو میں پیوست ہو گیا ۔ رامین لپک کر اس کے پیچھے

سوار ہو گیا، اور لاشاری سردار کو بچالے گیا۔ لاشار کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ رندوں کا لشکر تعاقب کرنے کے لئے بڑھا، مگر چاکر اعظم نے روک دیا اور پکار کر کہا:۔

"بہادرو! تلواریں روک لو! بھگوڑوں کا تعاقب کرنا جوانمردوں کا کام نہیں۔ آؤ، ربّ جلیل کا شکر ادا کریں۔ جس نے ہمیں فتح و نصرت عطا کی۔ وہ ہمیشہ حق پر چلنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔

رندوں کی پسپائی

یہ لڑائی "تیس سالہ جنگ" کے نام سے مشہور ہے۔ عرب کے ایام جاہلیّت میں بنی بکر اور بنی تغلب کے مابین بھی اسی قبیل کی طویل جنگ ہوئی تھی جو "حرب بسوس" سے موسوم ہے۔ انگریز مؤرخین آغازِ جنگ کی تاریخ ۱۵۴۰ء لکھتے ہیں۔ یہ جنگیں پچیس دفعہ لڑی گئیں جس میں دس مرتبہ لاشاریوں کو اور پندرہ بار رندوں کو فتح ہوئی۔ لیکن قابل ذکر تین جنگیں ہیں پہلی جنگ دآبادی کے قریب ہوئی جس میں میر گواہرام کو شکست ہوئی دوسری نلی کے مقام پر لڑی گئی۔ اس میں لاشار نے رندوں سے اپنی شکست کا بدلہ چکا لیا۔ آخری جنگ میں رندوں کو فتح ہوئی اور لاشار ہزیمت اُٹھا کر گجرات کی طرف منتقل ہو گئے۔ اب ہم دوسری جنگ کا ذکر کر رہے ہیں۔

گواہرام جب ہوش میں آیا تو اس نے اپنے دوستوں کو طلب کیا اور کہا۔ ایک بار پھر قسمت آزمانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ عمر نوحانی نے مشورہ دیا کہ اس وقت ہمیں اپنے طاقت ور ہمسایوں سے بھی مدد لینی چاہیئے۔ میر گواہرام نے اس مشورہ کو پسند کیا۔ بھٹو سرداروں کے پاس عمر نوحانی کو روانہ کیا اور خود زخموں کے باوجود ٹھٹھہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اس موقع پر بے اختیار چند اشعار میر گواہرام کی زبان پر آ گئے۔ جو ان کے خیالات و احساسات اور جذبات کے بہترین عکاس تھے ؎

"میں نے طنز کے طور پر جو نظم کہی تھی اس سے میر چاکر کے دماغ
میں فتور آ گیا ہے۔
وہ سچ مچ یہ سمجھنے لگا ہے کہ شاید اس جیسا بادشاہ دُنیا میں کوئی
ہُوا ہی نہیں، اور وہ ہم جیسے لوگوں کی پرواہ تک نہیں کرتا۔"
خدا مجھے کسی دن موقع دے گا۔ میں سامرہ اور بھٹی افواج کا منتظر
ہوں!
میں ٹھٹھہ کی فوجیں اس پر چڑھا لاؤں گا۔ جو ہاتھوں میں غضب کی
آگ لئے آئیں گے اور رندوں کے لشکر کو آگ لگا کر ایسا منتشر
کر دوں گا جیسے کہ جنُوبی ہوا جلتی آگ کو پھیلا دیتی ہے۔

اپنے بہادر دشمنوں کے گھروں کو جلا کر بھسم کر دوں گا۔ ایسی آگ لگاؤں گا کہ اس کے دوست دہلی کے ترک بھی نہ بجھا سکیں گے!"

الغرض لاشار اتحادی لشکروں کے ساتھ بڑی شان سے رندوں کی طرف بڑھے۔ بی برگ کی طرح لاشار میں بھی ایک صلح جو اور امن پسند انسان تھا اور وہ میر گوآہرام کا بوڑھا باپ میر نود بندغ تھا۔ جب اس نے سمہ اور بھٹو کی فوجیں بیٹے کی کمک پر دیکھیں تو حیران رہ گیا۔ بولا:۔

"بیٹا! کل تک تم دو بھائی لڑ رہے تھے، آج تم غیروں کو چڑھا لائے اس کا نتیجہ کیا ہو گا! اگر چاکر کو شکست ہوئی اور رند ختم ہو گئے تو نقصان کس کا ہے؟"

میر گوآہرام نے عرض کیا:۔

"ابا جان! جنگ کے دوران صلح کی باتیں مناسب معلوم نہیں ہوتیں لوگ اسے بزدلی پر محمول کرتے ہیں۔ چاکر اپنی فتح کے نشے میں بدمست ہو رہا ہے۔"

میر نود بندغ نے فرمایا:۔

"چاکر نے فتح پانے کے باوجود تمہارے گھروں پر حملہ نہیں کیا۔ کسی کا مال نہیں چھینا۔ تمہاری رعایا کو پریشان نہیں کیا اس نے جوانمردوں کی طرح اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا ہے۔ اور اب وہ مطمئن ہے۔ اگر تم پہل نہ کرو

تو وہ بھی تم پر حملہ نہیں کرے گا۔ بیٹا! تم سے مِنّت کرتا ہوں کہ جو آگ بڑی مُشکل سے بُجھی ہے، اُسے پھر ہوا نہ دو!"

گواہرام نے عرض کیا:۔

"پیارے ابّا! تمام لاشاری شرم سے گھروں میں دبکے پڑے ہیں، اگر ہم نے رندوں سے شکست کا بدلہ نہ لیا تو ہمارا قبیلہ غیرت وحمیّت کھو بیٹھے گا۔ مجھے صرف ایک دفعہ اپنی شکست کا بدلہ لے لینے دیجئے، پھر تلوار کو توڑ ڈالوں گا!"

المختصر، میر نودبندغ کی جوانوں کے آگے ایک نہ چلی اور رند و لاشار ایک دفعہ پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ چاکرِ اعظم بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے جس صف پر حملہ کرتے اُسے ختم کر کے رکھ دیتے۔ میر گواہرام الگ شمشیر زنی کے جوہر دکھا رہا تھا۔ کئی دنوں تک یہ خوفناک لڑائی ہوتی رہی۔ رِند بڑی بہادری سے لڑے، مگر چونکہ تعداد میں تھوڑے تھے لاشار کو مغلوب نہ کر سکے۔ میر جاآن نرغے میں پھنس گیا اور لاشاریوں نے گھیر کر قتل کر دیا۔ بی برگ گھوڑا دوڑا کر آگے بڑھا، گواہرام مقابلے پر نکلا۔ دونوں سرداروں نے خُوب دادِ مردانگی دی، مگر ایسے عالم میں عُمر خاں نوحانی نے بی برگ پر تیر پھینکا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اُس نے کراہتے ہوئے کہا:۔ "گواہرام! افسوس، بہادر اِس طرح نہیں لڑا کرتے!"

چاکر اعظم نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اس پر سکتہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس کے بہادر ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے، وہ اپنے خون میں نہائے مگر وفاداری کے پرچم کو بلند رکھا۔ چاکر زخموں سے چُور چُور ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود گھوڑی پر سوار اور اپنے جوانوں کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ گو آہرام جانتا تھا کہ چاکر شمشیر زنی میں یدِطولیٰ رکھتا ہے اور کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس کے دستے نے پے بہ پے کئی تیر پھینکے، جو ٹھیک نشانے پر پڑے۔ خانِ اعظم کی گھوڑی چھلنی ہو کر گر پڑی اور ساتھ ہی خود بھی زمین پر آ رہے۔ شجاعت و جرأت کا یہ آفتاب غروب ہونے کو تھا کہ دفعتہً میرِ نودبندغ آ پہنچا۔ اُس نے چاکر کو اُٹھا کر اپنی گھوڑی پھُول پر سوار کیا اور کہا:

”بہادر چاکر! اب کسی طرف نکل جاؤ! دُشمن تیری تلاش میں ہیں!“

چاکر نے تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ ”وہ میری تلاش میں کیوں ہیں، میں خود اُن کی تلاش میں ہوں، وہ جہاں کہیں ہوں گے میں ڈھونڈ کر اُن کا مقابلہ کروں گا۔ ابھی میری نبضیں کام کر رہی ہیں اور میرے جسم میں خُون کے چند قطرے باقی ہیں۔“

میر نودبندغ نے کہا:-

”جاؤ چاکر! دیر نہ کرو! لڑنے کا وقت کافی پڑا ہے۔ جب تمہارے

زخم مندمل ہو جائیں، پھر دشمنوں سے حساب چکا لینا!"

نودبندغ نے گھوڑی کو چھڑی لگائی اور وہ ہوا ہو گئی۔ شاعر کہتا ہے :-

" میر چاکر مسلسل لڑنے کے سبب تھک گیا تھا۔ بایں ہمہ ننگی تلوار لئے میدانِ جنگ میں جما کھڑا تھا۔

اور تھکاوٹ کی وجہ سے صرف ڈھال سے لاشاری تیروں
کی مدافعت کر رہا تھا۔ یکایک لاشاریوں کے تیر کی بوچھاڑ
ہوئی۔
میر نودبندغ کی نظر چاکر پر پڑی۔ اس نے اپنی پھول نامی
گھوڑی کو موڑ کر میر چاکر کو بزور اس پر بٹھایا۔
اور گھوڑی کو بھگا دیا!
خدا کی قدرت سے
خون سے لت پت میدانِ جنگ اور گہرے کھڈوں سے
اس کی گھوڑی پھول صاف نکل گئی!
دشوار پہاڑوں اور گہری غاروں سے
جہاں مار خوروں کی رہائش ہوتی ہے۔
پھول پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچی!"

آخر یہ راز فاش ہو کر رہا، اور لاشاریوں کو چاکر کے بچ کر نکل جانے کا علم ہو گیا۔ میر گواہرام تو ادب سے کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن دُوسرے لاشاری کہاں معاف کرتے۔ بہار خاں نے میر نودبندغ کو طنزاً شاباش دیتے ہوئے کہا:۔

"اے نودبندغ! تم رند ہو، لاشاری کبھی نہیں بنو گے۔ آج چاکر کو کون زندہ چھوڑتا! ہم اس کی گردن جوار کے بھٹے کی طرح کاٹ ڈالتے اور سبّی کی حکومت ایک ہی حملے میں جیت لیتے!"

نودبندغ نے جواب دیا:۔

"میں رند نہیں، بلکہ لاشاری ہوں!
البتہ میری ماں رند ضرور تھی
میں نے اس خاتون کا دودھ پیا ہے
جب وہ مجھے خوبصورت پنگھوڑے میں سُلا کر لوری دیتی تھی
تو کہتی تھی ——
اے نورالعین! کسی دن میر چاکر کے کام آنا!
جنگ، وجدل اور قتل و غارت کے موقع پر
جب اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے
تو اُسے صاف بچا لینا —— !

مجھے ایسے ہی دن کا انتظار تھا
ورنہ چاکر کا لحاظ کون کرتا ——!!"

چاکر تھنک

کوہستانِ مری میں ایک جگہ "چاکر تھنک" مشہور ہے اور ایک پہاڑ کے اوپر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں چاکر کی زرہ پڑی ہوئی ہے یہ پہاڑ بہت اونچا ہے۔ مری بگٹی کے کوہستانی قبائل یقین رکھتے ہیں کہ میر چاکر صاحب کرامات تھے اور اعجازی طور پر اس جگہ آمدو شد رکھتے تھے۔

بلاشبہ اس مقام تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ میر چاکر نے لاشار سے شکست کھانے کے بعد کچھ عرصہ یہاں گزارا۔ دُشمن یہ جاننے کے باوجود کہ چاکر اس جگہ موجود ہے انہیں گرفتار نہ کرسکا۔ جب ان کے زخم مندمل ہوگئے تو آپ نے چند سرداروں کی معیّت میں ہرات کا رُخ کیا۔

چاکرِ اعظم ہرات میں!

میر چاکر خاں رِند ہرات کے ارادہ سے جب گھوڑی پر سوار ہونے لگے تو بے اختیار یہ اشعار اُن کی زبان پر آگئے ؎

"مجھے اپنے مانگ والے سر کی قسم ہے،
جس پر پگڑی باندھتا ہوں
ایک بار لاشار پر ایسی آفت ڈھاؤں گا، کہ
اُن کے جسم میرے تیروں اور نیزوں سے چھاننی کی طرح چھلنی
ہو جائیں گے!
میرے مقابلے پر آنے کی صرف وہی شخص جرأت کر سکتا ہے،
جس کی موت آ چکی ہو!
اور جس کی زندگی کا پیالہ لبریز ہو چکا ہو!"

اِن اشعار سے میر چاکر خاں کے آئندہ عزائم کی جھلک نظر آتی ہے۔ جب ان کا قافلہ ہرات کے قریب پہنچا اور سلطان کو ان کے آنے کی اطّلاع ہوئی، تو اس نے اپنا ایک معزّز سردار ان کے استقلال کے لئے بھیجا۔ اور بڑی عزّت سے اپنے ہاں ٹھہرایا۔ ہرات پر ان دنوں تیموری نسل کا ایک بادشاہ سلطان حسین حکومت کرتا تھا۔ اس سے بلوچوں کے تعلّقات بے حد اچھے تھے۔ میر چاکر خاں نے کہا:-

"اے سلطان! ہم لوگ امن اور چین کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ لاشار نے بلا وجہ میری بے قصور رعایا کے جانور ذبح کر ڈالے، ان کے گھروں کو آگ لگا دی ـــ ندی! جس پر میرے ملک کی معیشت کا

انحصار تھا، بند کر دی۔ کھیت سوکھ گئے۔ اور جانور پیاسے مرنے لگے اس پر اُن کے اور ہمارے درمیان جنگوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کبھی بار ہمیں شکست ہوئی اور کبھی بار اُنہیں۔ آخری بار وہ سندھ سے سُمّہ اور بھٹو کی فوجیں لے آئے، اُن کے مقابلہ میں ہم بہت تھوڑے تھے، اس لئے شکست کھائی۔"

سلطان نے کہا:۔

"جام فیروز اور بھٹو کو پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانی مناسب نہ تھی، یہ ان کی زیادتی ہے۔"

اس کے بعد میر چاکر خاں نے گراں قدر تحائف پیش کئے اور سُلطان نے فوج ہمراہ کر دینے کا وعدہ کر لیا۔

لاشاری وفد کی باریابی

میر گواہرام کو چاکر اعظم کی روانگی کا علم ہُوا تو اس نے فوراً جنگی کونسل طلب کی اور کہا:۔

"دوستو! آپ پر یہ واضح ہو چکا ہو گا کہ شکست کھانے کے باوجود رند قبائل کی نخوت میں کوئی فرق نہیں آیا وہ ایک اور حملے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ آپ لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود ان کے

قلعوں کی ایک اینٹ بھی قبضے میں نہیں لاسکے۔ میرے خبر رساں سپاہیوں کا کہنا ہے کہ رند سردار فوجی دستے کے ہمراہ ہرات کو روانہ ہوچکا ہے شاہ حسین سے اس کے گہرے مراسم ہیں وہ یقیناً ایک زبردست کمک لے کر آئے گا۔ اگر ہم غافل پڑے رہے تو ہماری تباہی یقینی ہے۔

اُمرا نے مشورہ دیا کہ ہمیں بھی بلا توقف سلطان حسین سے رجوع کرنا چاہئیے۔ اور اس سے غیر جانبدار رہنے کی درخواست کی جائے۔ ساتھ ہی بھٹو اور سمّہ امرا سے مزید فوجیں منگوائی جائیں۔

چنانچہ میر گواہرام نے اپنے بہادر بیٹے میر بی بکر کو قیمتی تحائف دے کر چاکر خاں کے تعاقب میں روانہ کیا اور عین اُس وقت جبکہ چاکر خاں سلطان کے دربار سے فوجی امداد کے وعدے لے کر نکل رہا تھا۔ نقّارے پر چوٹ پڑی اور چوبدار نے پکار کر کہا کہ لاشار قبائل کے سردار کا ولی عہد میر بی بکر شرفِ باریابی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہے!

میر بی بکر ایرانی امرا کی معیت میں حاضر ہوا۔ اور کورنش بجالانے کے بعد تحائف پیش کئے۔ اُن میں ایک قالین ایسا تھا جو سونے کے تاروں سے بنایا گیا تھا۔ سلطان نے ان تحائف کو بڑی بے اعتنائی سے قبول کیا کیونکہ یہ باتیں اس کی وعدہ ایفائی میں سنگِ راہ بن رہی تھیں۔

شاعر کہتا ہے:-

”سترہ سو بہادر جوانوں اور بھائیوں کے قتل کے غم میں چاکر نے ایک پہر بھی آرام نہ کیا اور ہرات کے مشہور اور دولت سے معمور شہر میں جا پہنچا۔ اس نے سلطان سے امداد کی درخواست کی۔ یہ سُن کر میر بی بگر، رامین اور گوا ہرام نے بھی (سلطان کی خدمت میں) سونے کے تاروں سے بنا ہوا قالین بھجوایا، جسے تُرک سلطان نے بے اعتنائی سے قبول کیا۔“

میر چاکر کے حربی کمالات اور فہم و تدبّر کا امتحان

سُلطان کی خدمت میں لاشاری وفد نے دا شگاف الفاظ میں استدعا کی کہ یہ ہماری آپس کی جنگ ہے اور سلطان دونوں فریقوں کا دوست ہے۔ اس لئے اسے غیر جانب دار ہی رہنا چاہیئے۔ اِس موقع پر سلطان کو ایک تجویز سُوجھی اور اس نے اس پر فوراً عمل بھی کیا۔

اُس نے اپنے ایک امیر کے ذریعے میر چاکر کو کہلا بھیجا کہ ہمارے امرار فوجی امداد دینے سے پہلے آپ کے حربی کمالات اور فہم و تدبّر کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس آزمائش کے لئے تیار ہیں؟

خان اعظم اصل مطلب کی تہہ تک پہنچ گئے۔ لیکن سوائے امی کے

اور چارہ ہی کیا تھا۔ جواب دیا کہ اگر بادشاہ کی یہی منشا ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے!

خانِ اعظم فوراً دربار میں حاضر ہو گئے۔ ان کے چہرے پر کسی قسم کے فکر و تردّد کا نشان تک نہ تھا۔

نہتّے سردار پر ہاتھی کا حملہ

بادشاہ نے کہا، "اے بہادر سردار! اگر ایک آدمی تنہا ہو، اور اس کے پاس ہتھیار بھی نہ ہو تو وہ اپنا بچاؤ کیسے کر سکتا ہے؟"

خانِ اعظم نے فرمایا کہ مقابلے کے لئے اطمینانِ قلب ضروری ہے، اگر حواس قائم رہیں تو ہاتھ اور دِل خود ہی اپنا ساتھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہتھیار وہی ہے جو ضرورت کے وقت ہاتھ کو میسّر آجائے۔

بادشاہ نے خانِ اعظم سے ہتھیار لے لئے اور ان کے تمام وفادار ساتھیوں کو بھی نہتّا کر دیا۔ اُنہیں ایک میدان میں لے گئے۔ بادشاہ اور امرائے دولت یہ تماشا دیکھنے کے لئے دیوانِ عام کی چھت پر چڑھ گئے اور چاکر خان سے کہا کہ آپ اپنی بہادری اور اولوالعزمی اور مستقل مزاجی کا ثبوت دینے کے لئے ٹھہرے رہیں۔

اس اثناء میں ایک بدمست اور خُونی ہاتھی کو لے آئے، جس

نے چھوٹتے ہی خانِ اعظم پر حملہ کر دیا۔ رند سردار نے دائیں بائیں دیکھا۔ اُسے اور تو کوئی چیز نہ ملی ایک کُتیا پاس لیٹی تھی، خانِ اعظم نے اُسے ایک ٹانگ سے پکڑ کر ہاتھی کی سونڈ پر دے مارا کُتیا سونڈ سے چمٹ گئی، اور ہاتھی گھبرا کر چنگھاڑتا ہوا واپس بھاگ گیا۔ چاروں طرف سے واہ واہ کا شور اُٹھا اور سردار فاتحانہ انداز میں اپنی قیام گاہ کو لوٹ آیا۔

وحشی گھوڑے کی سواری

تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ دوبارہ ایک ایلچی تیزی سے آیا اور کہا چاکر! بادشاہ نے تمہیں طلب کیا ہے اور تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہے۔ خانِ اعظم پھر دربار میں گئے۔ بادشاہ نے کہا:-

"اے سردار! شاہی اصطبل میں ایک گھوڑا ہے، جو سات پشتوں سے خالص نسل کا چلا آتا ہے۔ دوستوں اور دشمنوں کے سامنے اس پر اسی جگہ سواری کرو!"

خانِ اعظم نے بلا کسی تردّد کے فرمایا:-

"لے آئیے میں اس پر سواری کروں گا۔"

چنانچہ سات آدمی فولادی لگام تھامے، اور سات آدمی پکڑے دھکڑے گھوڑے کو لے آئے اور ایک اندھے کنوئیں کے پاس لاکر کھڑا

کر دیا۔ گھوڑے نے اُچھلنا کودنا اور ہنہنانا شروع کر دیا۔ میر چاکر گھوڑے کے قریب آئے اور کہا گھوڑے کو چھوڑ دو اور تم سب چلے جاؤ۔

خانِ اعظم نے گھوڑے کو تھپتھپایا اور اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا:۔

"اے گھوڑے! تم دُلدُل کی اولاد ہو
اور میں شیہکؒ بزرگ کا بیٹا ہوں
تمہارے ساتھ جبر کیا جا رہا ہے
اور میرے ساتھ دھوکا اور بے ایمانی
تمہارے پاس قوّت ہے اور میرے پاس عقل
سامنے والے کنوئیں کو دیکھ! جس کا مُنہ ہوشیاری سے ڈھکا ہُوا ہے۔
خبردار! دوستوں اور دُشمنوں کے سامنے خاموشی سے کھڑا رہ، اور دم نہ مار!"

یہ سُن کر گھوڑا نرم پڑ گیا۔ اِس قدر نرم کہ بچہ بھی اس کی باگ پکڑ سکتا تھا۔ چاکر اعظم لپک کر اس پر سوار ہو گئے اور سرپٹ دوڑا کر دربارِ عام سے باہر لے گئے اور پھر واپس لے آئے۔ دربار ایک دفعہ پھر تالیوں سے گونج اُٹھا۔ بادشاہ نے کہا:۔

"شاباش رند سردار! آپ اِس آزمائش پر بھی پُورے اُترے!"

خانِ اعظم اپنی قیام کو لوٹ گئے۔ بادشاہ انہیں کسی دُوسری آزمائش میں ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر لاشار امرا نے سُلطان کو پھر رشوت کے طور پر قیمتی چیزیں پیش کیں، جس پر سلطان نے تیسری بار چاکر خاں کی طرف اپنا ایلچی بھیجا۔

شیر سے مقابلہ

شاعر کہتا ہے، قاصِد دوڑتے ہوئے آئے۔ کہا:-

"اے چاکر! بادشاہ تمہیں پھر یاد کر رہا ہے
اور تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہے
چاکر دربار میں حاضر ہُوا
بادشاہ نے کہا
میرا ایک طاقت ور خُونی شیر ہے۔
میں نے تیری موتیوں جیسی تلوار کی شہرت سُنی ہے
لہٰذا اپنی تلوار اس شیر پر آزماؤ!"

ایک بڑا آہنی پنجرا لایا گیا۔ تمام لوگ مکانوں اور دیواروں پر چڑھ گئے صرف رند سردار تن تنہا کھڑا رہ گیا۔ تین دن کے بھُوکے شیر کو کھول دیا

گیا۔ شیر دھاڑتا ہوا چاکر پر حملہ آور ہوا۔ رند سردار نے تلوار نیام سے نکالی اور اس انداز سے وار کیا کہ شیر کو کاٹ کر رکھ دیا۔ لال موزے پہننے والے امیر کو اِس دفعہ پھر فتح نصیب ہوئی۔ مذبوح شیر کی صدائے علنیف بلند ہوئی اور ہر طرف سے آفرین آفرین کی آوازیں آنے لگیں۔

مادرِ سلطان کا انتباہ

جب دربان اور خواجہ سرا سلطان کی ماں کے پاس یہ خبر لے گئے تو بیگم نے اپنے بیٹے سے کہا:۔

"چاکر رند قبائل کا سب سے بڑا سردار ہے
اور وہ تمہارے پاس مدد کے لئے آیا ہے
اب اُسے زبردست فوج دو!
اسے جنرل ذوالنّون کی قہار فوجیں دے دو!
اگر ایسا نہ کرو گے
تو میر چاکر کی خاطر
میں اپنی تیس سالہ خلوت نشینی ختم کر کے
سُرخ نقاب کو اُلٹ کر باہر نکل آؤں گی!"

یہ سن کر بادشاہ نے ازراہِ عزّت افزائی ایک شتر بچہ میر چاکر کے نام پر

ایک مراسی کو بخش دیا۔ جس نے اِس موقع پر میر چاکر کی بہادری پر ایک وجد آور اور ولولہ انگیز قصیدہ پڑھا تھا۔

فیصلہ کُن جنگ

اِس طرح کئی قسم کی مشکلات اور آزمائشوں سے دوچار ہونے کے بعد چاکرِ اعظم ایک عظیم لشکر کے ساتھ پیر لاکھا اور لاکھو کے مقام سے گزرتا ہوا سبّی کے قریب پہنچ گیا۔ ہر طرف پیادے دوڑے، اور آن کی آن میں کچھروک کا میدان لاکھوں سواروں اور پیادوں سے بھر گیا۔ ایک طرف رِند بلوچوں کا بے قیاس لشکر تھا۔ دُوسری جانب جام فیروز بھٹو اور لاشار کی عظیم فوج۔ رِند جوشِ انتقام میں لال بھبوکا ہو رہے تھے۔ اُدھر لاشار بھی پُوری طرح تیار تھے۔ رِند سردار نے اپنی فوج کی کثرت اور طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے میر گواہرام سے خطاب کیا:۔

"ایک مرتبہ تم اپنے کھیل میں کامیاب ہوئے اور رِندوں کی تیز رفتار گھوڑیوں کو ہلاک کیا، جن کے ٹاپوں کا نشان درّہ مُولا کے نشیبی میدان میں صاف طور پر اُبھرا ہوا ہے۔

لیکن انتقام کو یاد رکھو!

کیونکہ بنگی، حسن اور ابنِ نودک، آدم، نودبندغ، احمد اور

عظیم الشان کلّو ایک ساتھ قتل ہوئے ہیں!
تم نے میدان چھوڑ دیا!
اس کشمکش کے دن
جب رندوں کے تیر پیچھے پنڈلیوں پر برسنے لگے
تم ڈاب کے قلعہ سے بھاگ کھڑے ہوئے اور درہ مُولا کے
مدخل پر جا کر سانس لی!
اس کے باوجود اس قسم کا طنز میں نے تم پر نہ کیا
اور نہ گویّوں کی ٹولی طعن و تشنیع کے لئے تمہاری طرف روانہ
کی!
کہ وہ تار پر مضراب مار مار کر تمہیں ایسا گانا سنائیں جس سے
تمہاری خفّت ہو۔
یاد رکھو!
اب میں انسان ہونے کی حیثیّت میں تم پر ٹوٹ پڑوں گا!
جیسے کہ ایک آدمی
جسے اس کے بھائیوں نے تباہ کر دیا ہو!
ہم تیز گھوڑیوں والے رند ہیں، اب ہم تمہیں پھونک دیں گے
اور ہوا میں اڑا دیں گے

ہم حملوں میں دونوں جانب سے آتے ہیں
اور جو کچھ تمہارے پاس ہے اس میں سے اپنے حصّے کا مطالبہ
کرتے ہیں!
اے گواہرام!
کان کھول کر سُن!
طویل سفر کر! ——— شاید تمہاری خوش قسمتی لوٹ آئے!"

اسی طرح میر گواہرام نے بھی اپنے لشکر کو آراستہ کرتے ہوئے چند اشعار گنگنائے جن کا ماحصل درجِ ذیل ہے:-

"اہاہا! ہماری فتح بھی کیسی فتح تھی!
میں نے اپنے دُشمنوں پر ایک ہلّہ بولا اور جنگی گھوڑے
بھاگ کھڑے ہوئے۔
گورخروں کی طرح، مع پیالہ نما کھُروں کے!
بستی میں ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ چاکر اس صدمہ سے
جانبر نہ ہو سکے گا!
چاکر مخروطی چٹان پر چڑھ گیا
متدو کے پیارے بیٹے نے پیٹھ پھیر لی!

تھکا دینے والا بھیڑیا چھتنار درخت کے سائے میں اُسے دیکھتا رہا!

اور وہ اُس ملک میں چلا گیا جہاں جنگلی بیری پکی ہوئی تھی!"

پھر اُس نے اپنی عظیم فوج سے خطاب کیا:۔

"بہادرو! ہوشیار ہو جاؤ!!

رِند سردار اپنی خفّت مٹانے کے لئے ترکوں کی بے پناہ فوج لے کر چڑھ آیا ہے۔ ترکوں سے تم ناواقف نہیں ہو۔ اور رندوں سے تم گزشتہ جنگ میں لڑ چکے ہو۔ آج وہ پھر تمہاری تلواروں کی زد میں ہیں۔ اُنہیں ایسا سبق دو کہ وہ پھر بھول کر بھی اِدھر کا رُخ نہ کریں!"

عُمر نوحانی گرج رہا تھا۔

"بہادرو! آج تم نے خود اپنی قوّتِ بازو سے اپنی تقدیر بنانی ہے۔ یاد رکھو! ذلّت کی صد سالہ زندگی سے عزّت کا ایک لمحہ بہتر ہے اپنے گھوڑوں کو مہمیز کرو اور رِندوں پر چھا جاؤ!"

رامین کہہ رہا تھا:۔

"شاباش بہادرو! اپنی زندگی کا ثبوت دو! اگر رند اچھے شمشیر زن ہیں تو تمہاری تیر افگنی کا بھی جواب نہیں۔ اگر اُن کے ہمراہ ترکوں کی کمک

ہے تو تمہارے ہمرکاب بھی ٹھٹھہ اور بھٹو کی زبردست فوجیں ہیں۔ خُوب جم کر لڑو اور دُشمنوں کے دانت کھٹے کر دو!"

دونوں لشکر ایک دُوسرے کے محاذ میں پہنچ چکے تھے۔ گھوڑوں کے ہنہنانے اور سپاہیوں کے شور و غل سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ رِندوں کے لشکر سے خانِ اعظم میر چاکر خاں کی گرج سُنائی دے رہی تھی اور وہ کہہ رہے تھے :۔

"میرے شیر دل دوستو! گزشتہ جنگ میں ہم طاقت اور قوّت میں بہت کم تھے۔ آج خدا کے فضل سے ہم ان سے تعداد اور طاقت میں زیادہ ہیں دُشمن پچھلی فتح کے گھمنڈ میں آج بھی فخر و غرور سے سر اُٹھائے چلا آتا ہے آج تم نے اُن سے میر جان کا بدلہ لینا ہے۔ میر حسن کا بدلہ لینا ہے اور علی خاں کا بدلہ لینا ہے۔ تمہارے کتنے بہادروں کو انہوں نے دھوکے سے مارا ہے۔ ایک ایک کے بدلے میں دُشمن کے سینکڑوں سپاہی کاٹ کر رکھ دو!"

بی برگ کہہ رہا تھا :۔

"بہادرو! تمہارے جو دوست گزشتہ جنگ میں مردانہ وار لڑتے ہوئے مارے گئے تھے آج اُن کی روحیں تمہاری مردانگی کا تماشا دیکھنے کے لئے آسمانوں سے جھانک رہی ہیں۔ دُشمن پر برقِ صاعقہ بن کر گِرو اور انہیں گاجر مُولی کی طرح کاٹ کر رکھ دو!"

چاکراعظم کا جھنڈا حرکت میں آیا۔ نقارے پر چوٹ پڑی۔ گھوڑے ہنہنانے لگے۔ تلواروں کی کھٹاکھٹ اور مار دھاڑ کے شور و غل سے قیامت برپا ہوگئی۔ رند اور لاشار کی جنگ جو تیس سال پیشتر ہوئی تھی آج پورے شباب پر تھی۔ چاکراعظم اور ان کے بہادر رفقاء انتہائی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ جدھر رُخ کرتے تھے صفوں کی صفیں اُلٹ کر رکھ دیتے تھے۔ بہادر نودبندغ جو پیرانہ سالی کے باوجود جوانوں کی طرح لڑ رہا تھا۔ ترکوں کے نرغے میں گھِر گیا۔

میر گواہرام نے رفیقوں سے کہا :۔ "بائیں طرف زور کرو اور ابّا کو بچانے کی کوشش کرو!"

چاکراعظم نے یہ نقشہ دیکھا تو گھبرا کر کہا :۔

"میر نصرت! ذرا دیکھنا! میر نودبندغ ترکوں کی زد میں ہیں۔ میں اِس پیرِ مرد کا مرنا پسند نہیں کرتا، اسے ہر قیمت پر بچاؤ!"

میر نصرت نے جواب دیا :۔

"محترم سردار! اِس موقع پر اپنی فوج کو روکنا یا اسے کوئی اشارہ کرنا بھی تو ٹھیک نہیں۔ اِس وقت ادنیٰ سی لغزش ہمارے لئے شکست کا موجب بن سکتی ہے۔"

اسی اثناء میں میر نودبندغ پر ترکوں کی طرف سے تیروں کی زبردست

بوچھاڑ پڑی اور وہ چھلنی چھلنی ہو کر گر پڑے۔ چاکر اعظم انہیں سنبھالنے کے لئے لپک کر پہنچے اور سپاہیوں کو ڈانٹ کر کہا:

"ہٹ جاؤ! چھوڑ دو اس پیرمرد کو! یہ میرا محسن ہے اس نے میری جان بچائی تھی۔"

میر نودبندغ نے پانی طلب کیا۔ چاکر خاں گھوڑے سے چھلانگ لگا کر اُترے اور اپنی چھاگل سے نودبندغ کے حلق میں پانی ٹپکانے لگے۔

نودبندغ میں ابھی جان باقی تھی اُس نے آنکھیں کھول کر غور سے دیکھا اور میر چاکر کو پہچان کر مرتعش آواز میں کہا:

"چاکر بیٹا! جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ خاندان کی عورتوں کا خیال رکھنا....."

اور وہ ہچکی لے کر اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ چاکر اعظم نے حکم دیا کہ اس بزرگ خاندان کی لاش کو بڑی عزت و احترام سے میرے خیمے میں لے جاؤ!"

اُدھر میر گوہرام کو جب صورت حال کا علم ہوا تو اُن پر رنج و غم کے بادل چھا گئے۔ ایک آہِ جگر دوز کھینچ کر کہا۔ اُف! میرا شفیق والد مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا۔ آہ، ابّا جان! آپ کے بغیر جینا بیکار ہے!"

عمر نوحانی نے کہا۔ "سردار! یہ وقت افسوس کرنے کا نہیں، خاندان

کے ناموس اور عزت بچانے کا ہے۔"

اِس سے میر گوآہرام کے خیالات نے یکلخت پلٹا کھایا اور کہا۔

"آپ نے ٹھیک کہا۔ میں اپنے قبیلے پر سے تصدّق ہونا چاہتا ہوں"

للکار کر کہا۔

"آؤ بہادرو! آگے بڑھیں۔"

میر گواہرام انتہائی پامردی اور جوش سے تلوار چلانے لگے۔

میدانِ جنگ میں ایک دفعہ پھر جان پڑ گئی۔ چاکر اعظم پکار رہے تھے۔

"شاباش بہادرو! دُشمن تھک چکا ہے۔ یہ اس کی آخری کوشش ہے

آگے بڑھو اور تیس سال کی طویل جنگ کو اسی لمحہ میں ختم کر دو!"

اُدھر سے میر گواہرام کی درد بھری آواز آرہی تھی۔

"میرے جاں نثار رفیقو! لاشار قبائل کے ناموس کی لاج رکھو، یاد رکھو! تمہاری ذرا سی غفلت لاکھوں لاشاریوں کو موت کے مُنہ میں جھونک سکتی ہے۔"

اسی اثناء میں رندوں کی طرف سے تیروں کی بے پناہ بارش شروع ہو گئی۔ ایک تیر آیا اور میر گوآہرام کے سینے میں ترازو ہو گیا۔ "اُف، دُشمن کا مقصد پورا ہو گیا"۔ یہ کہا اور میر گوآہرام گھوڑے سے گر پڑا۔

عمر خاں نے کہا۔ "دوڑو! میر گوآہرام کو پامال ہونے سے بچالو!"

رندوں کا لشکر پُوری شدّت سے حملہ آور ہُوا۔ بے سردار کا لشکر منہزم ہو کر پیچھے ہٹنے لگا۔ چاکر اعظم کے لشکر میں فتح کا نقارہ بج رہا تھا لاشار مسلسل پسپا ہوتے چلے گئے۔ چاکر اعظم نے حکم دیا کہ لڑائی سے ہاتھ روک لو اور کسی کا تعاقب نہ کرو!"

ترک سردار نے کہا:۔

"اے رند سردار! اگر تعاقب نہ کریں تو ہمیں مالِ غنیمت کہاں سے ملے گا؟"

میر چاکر نے مکرّر فرمایا:۔

"میں مالِ غنیمت سے منع نہیں کرتا، مگر لاشاری میری قوم ہے اس کا ناموس مجھے اپنی جان سے بھی عزیز ہے۔"

ترک سردار نے جواب دیا:۔

"رند سردار! تم ناموس کی حفاظت کرو، ہم اپنے مالِ غنیمت کی حفاظت کریں گے!"

چاکر اعظم نے پھر کہا:۔

"جام فیروز اور بھٹو کے لشکروں کا خوب تعاقب کرو اور جو چاہو کرو۔ مگر کسی لاشاری سے تعرّض کیا تو آپ کے اور ہمارے دوستانہ مراسم ختم ہو جائیں گے!"

چاکر اعظم نے اپنے قابلِ اعتماد سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو لے کر لاشار کے علاقے میں پھیل جائیں اور انہیں ترکوں کی دستبرد سے بچائیں!

لاشار کا تعاقب

لاشار سردار میر گوآہرام کے قتل ہو جانے پر میر رامن نے شکست خوردہ قبائل کو تباہی سے بچانے کے لئے انہیں متحد کرنے اور ٹھٹھہ کی جانب بحفاظت لے جانے کی کوشش کی اور خانِ اعظم کی فوج بھی اُن کے تعاقب میں بڑھتی رہی، یہاں تک کہ جب لاشار ٹھٹھہ میں پہنچے تو میر رامن نے اپنے بھائی میر بوبکر خاں کو مع عیال و اطفال بڑودہ کی طرف روانہ کر دیا، اور خود بچی کھچی فوج کو لے کر دشمن کی طرف متوجہ ہوا، ٹھٹھہ کے قریب جو مقام اب "رامن اوتھل" کے نام سے مشہور ہے، یہاں زبردست جنگ ہوئی۔ میر رامن انتہائی پامردی کے باوجود غنیم کی افواجِ قاہرہ کو شکست نہ دے سکا، اور گجرات کی طرف منتقل ہو گیا۔

خانِ اعظم میر چاکر خاں نے اگرچہ لاشار قبائل کو شکست دیکر بلوچستان سے نکال دیا۔ مگر خود بھی اس سرزمین میں ٹک نہ سکا۔ اس وقت وہ اپنے ملک کے علاوہ لاشار کے وسیع خطے پر بھی قابض تھا، مگر اس کا دل اس

طویل جنگ کے بعد سبّی اور اس کے مضافات سے متنفر ہو گیا تھا۔ وہ اِس سرزمین میں کیسے رہ سکتا تھا جس میں اس کے ہزاروں اعزہ و اقارب اپنے خون میں آپ نہا گئے تھے۔ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ دہلی کی حکومت ہچکولے کھا رہی ہے اور ابراہیم لودھی امراء کا تعاون حاصل کرنے میں بُری طرح سے ناکام رہا ہے۔ اس کے دل میں بھی ایک نیا ولولہ پیدا ہُوا کچروک کا فاتح سبّی کے دشتِ بیدار کو چھوڑ کر برِّ صغیر ہندوستان کی طرف متوجّہ ہُوا۔ چنانچہ اپنے اپنے قبیلے کے سرداروں نے غلاموں کو حکم دیا:-

"سبک اندام سرنگ (سرخنگ)، کمیت گھوڑیوں کو اصطبل سے کھول لاؤ، اور باز جیسی تیز گھوڑیوں پر زینیں رکھ دو۔ جن میں سے ہر ایک کی قیمت نو نو ہزار روپے ہے۔ پہاڑی درّوں سے اُونٹوں کو ہانک کر لے آؤ!"

اپنی بیویوں سے مخاطب ہو کر کہا:-

"اپنے قلعوں سے نیچے اُتر آؤ، اپنے بستر، کپڑے، دریاں، سُرخ قالین، تکیے، دھاری دار کمبل، سانچے میں ڈھلے ہوئے پیالے، اور مکران کے بنے ہوئے آبخورے اپنے ہمراہ لیکر

آجاؤ۔ کیونکہ سردار نے یہاں نہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے
اور وہ کسی دُور دیس کو روانہ ہونے والا ہے!"

چنانچہ اس واقعہ کے تھوڑا عرصہ بعد بلوچوں کا یہ عظیم لشکر پانچ دریاؤں کی سرزمین کو اپنا وطن بنانے کی غرض سے مُلتان[1] کو روانہ ہو گیا۔

○

[1] خانِ اعظم میر چاکر خاں رند ست گھرہ ضلع ساہیوال میں محوِ خواب ہے۔

میواڑ کی رانی

"ہندوستان کے بادشاہ کو چتوڑ کی ایک مظلوم عورت کا سلام پہنچے۔ گجرات کے بادشاہ نے عاجز اور بے وارث سمجھ کر پوری طاقت سے اس پر حملہ کر دیا ہے۔ اس وقت کرناوتی، اس کے کمسن بچے اور چتوڑ کے ہزاروں، لاکھوں افراد کی عزت اور زندگی خطرے میں ہے۔ انتہائی مصیبت میں یہ دکھیارا کھی بھیج کر آپ سے خواہرانہ درخواست کرتی ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو اپنی مظلوم بہن کی امداد کو پہنچیے!"

کرناوتی

کچھ عرصہ گزرا۔ جب ہندوستان مغربی تکلفات اور دورنگی سے ناآشنا تھا۔ ہر طرف سکون و اطمینان کا دور دورہ تھا۔ چھوٹے بڑوں کا ادب کرتے تھے اور بڑوں کے دلوں میں عزیزوں کے لئے محبت اور شفقت کا دریا موجیں لیا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں ہندوؤں نے بھائیوں اور بہنوں کے درمیان محبّت اور اُلفت بڑھانے کے لئے راکھی کی ایک رسم جاری کر رکھی تھی۔ ہر سال ساون کے مہینہ میں جب موسلادھار بارشوں اور موسمی میووں کی کثرت سے ہندوستان جنّت نشان بنا ہوتا ہندوستان کی دیویاں اپنی حیثیت کے مطابق ریشم یا سُوت کی سُرخ رنگ کی ڈور لے کر اُسے نہایت خوبصورتی سے گوندھ لیتی تھیں۔ امیر زادیاں سنہری روپہلی تاروں سے اس میں طرح طرح کے موتی بھی پرو لیتی تھیں۔ اس موقع پر بہن اپنے بھائی کے ہاں جاتی اور اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی پر اس راکھی کو باندھ دیتی تھی۔ اس پر بھائی خوشی سے باغ باغ ہو

جاتا اور بہن کو قیمتی لباس اور نقد روپے ادا کرتا۔ اگر یہ راکھی کسی غیر شخص کے ہاتھ پر باندھ دی جاتی، تو وہ بھی اس دیوی کا "راکھی بند بھائی" بن جاتا تھا۔

سنہ ۱۵۲۵ء میں عروس البلاد چتوڑ پر سلطان بہادر شاہ والئ گجرات چڑھ آیا۔ رانا سانگا کی شیر دل رانی کرناوتی نے قلعہ بند ہو کر خوب مدافعت کی۔ اور چتوڑ کے راجپوتوں نے بھی اس بہادری سے مقابلہ کیا کہ سلطان دو ماہ کے طویل عرصہ میں چتوڑ کی ایک اینٹ پر بھی قبضہ نہ کر سکا۔ اسی لیل و نہار میں ساون کا مہینہ آگیا اور اس تقریب پر راجپوت دیویاں اپنے بہادر بھائیوں کے ہاتھوں پر راکھی باندھنے لگیں۔ مگر معمول کے مطابق خوشنما پوشاک اور نقدی کے لئے نہیں بلکہ اپنی عزتوں کی حفاظت کے لئے۔ راجپوت جوانوں نے بڑے بڑے قول و اقرار کئے۔ اور مصیبت کے اس عالم میں بھی حیثیت سے بڑھ کر بہنوں کو پوشاکیں اور نقد روپے ادا کئے۔ ادھر مہارانی نے بھی بڑے ارمانوں کے ساتھ راکھی تیار کی۔ ریشم کی ڈوری پر سنہری اور روپہلی تاروں کے ساتھ قیمتی موتی پروئے اور بڑی خوبصورتی سے اُسے گوندھا مگر متامّل تھی کہ اِس پریشانی کے وقت کسے پہنائے جو اس کی امداد کر

سکے۔ پہروں فکر مند رہی۔ آخر کسی خیال کے آنے سے دفعتہً اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ فوراً اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھا اور راکھی اس میں بند کر کے اپنے ایک معتمد سردار کو طلب کیا اور یہ چٹھی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا:۔

"یہ ایک پیغام ہے جو میں نے شہنشاہ ہند کے نام لکھا ہے۔ پَر لگا کر پہنچو، اور جہاں لشکرِ شاہی خیمہ انداز ہو۔ یہ خط شہنشاہ کے ملاحظہ سے گزار دو!"

راجپوت جوان نے سر جھکا کر مہارانی کو پرنام کیا، اور خط لے کر باد رفتار گھوڑے پر سوار ہو، ہوا ہو گیا۔

شہنشاہ ہند نصیر الدّین ہمایوں ان دنوں شیر خاں کی بغاوت فرو کرنے کے لیئے بنگال میں مقیم تھا۔ ایک دن عصر کی نماز سے فارغ ہو کر ایوانِ خاص میں اپنے امرائے خصوصی سے جنگی معاملات پر گفتگو کر رہا تھا کہ چوبدار اندر داخل ہوا۔ اور عرض کی حضور! چتوڑ کی مہارانی کا قاصد آیا ہے۔ رات دِن کے سفر نے اُسے نڈھال کر دیا ہے اور اس کا گھوڑا اتھکاوٹ کے مارے باہر دم توڑ رہا ہے۔

شہنشاہ نے فکر مند ہو کر کہا "اسے حاضر کرو!"

تھوڑی دیر کے بعد ایک بانکا ترچھا راجپوت جس کا چہرہ خزاں کے پتّوں کی طرح زرد ہو رہا تھا، بارگاہِ سلطانی میں حاضر ہُوا اور آدابِ شاہی بجا لانے کے بعد مہارانی کا خط اور راکھی پیش کی۔

شہنشاہ فرطِ حیرت سے چلّا اُٹھا۔

"راکھی! —— اور مہارانی کرناوتی کی! — میں اسے فخر سے اپنی کلائی پر باندھوں گا۔ اے محترم قاصد! آگے بڑھ، اور اپنے ہاتھ سے اس رسم کو ادا کر!"

خوشی سے قاصد کے آنسو نکل پڑے۔ اس نے بڑے اشتیاق سے شہنشاہ کے دائیں ہاتھ کی کلائی پر راکھی باندھی۔ دربار محوِ حیرت ہو رہا تھا اور خدا کی رحمتیں اُس وقت تیمور کے بیٹے پر نثار ہو رہی تھیں۔

"ہاں! —— اب خط پڑھو، بہن بھائی سے کیا مانگتی ہے؟"
شہنشاہ نے متبسّم ہو کر کہا۔

وزیرِ اعظم بیرم خاں نے خط پڑھنا شروع کیا۔

"ہندوستان کے شہنشاہ کو چتوڑ کی ایک مظلوم عورت کا سلام پہنچے۔ گجرات کے بادشاہ نے عاجز اور بے وارث سمجھ کر پوری طاقت سے اس پر حملہ کر دیا ہے۔ اس وقت کرناوتی، اس کے کمسن بچے اور

چتوڑ کے ہزاروں لاکھوں افراد کی عزت اور زندگی خطرے میں ہے انتہائی مصیبت میں یہ دُکھیا راکھی بھیج کر آپ سے خواہرانہ درخواست کرتی ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو اپنی مظلوم بہن کی امداد کو پہنچیے......"

بیرم خاں یہاں تک پڑھنے پایا تھا کہ شہنشاہ نے گلوگیر ہو کر کہا:-

"بس ــــ! زیادہ سُننے کی تاب نہیں رہی۔ لشکر میں اعلان کر دیجیے کہ کل علی الصباح لشکرِ ہمایونی کا رُخ چتوڑ کی طرف ہوگا۔ کمزور اور بیمار سپاہیوں کو الگ کر دیا جائے تاکہ لشکر کی روانگی میں تاخیر نہ ہو، دہلی کا شہنشاہ اپنی بہن کی امداد کو جلد از جلد چتوڑ کو پہنچنا چاہتا ہے!"

بیرم خاں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی:-

"عالم پناہ کا ارشاد بالکل بجا ہے۔ مگر دُشمن لومڑی سے زیادہ چالاک اور شیر سے زیادہ قوی ہے۔ اگر محاذِ جنگ سے کوکبۂ سُلطانی نے اتنی سرعت سے کوُچ کیا تو شیر خاں موقع پا کر دارالسلطنت پر قبضہ کرلے گا!"

"کچھ پرواہ نہیں ــــ ایک مظلومہ امداد مانگے، اور ہمایوں مصلحت دیکھے، یہ کبھی نہیں ہوسکتا!"

اُسی وقت اپنے دستِ خاص سے شہنشاہ نے مہارانی کرناوتی کو خط لکھا کہ،

"ہمایوں اپنی بہن کی امداد کے لئے کل صبح کو ہی یہاں سے چل پڑیگا اطمینان سے قلعہ بند ہو کر دُشمن کے حملوں کا جواب دیا جائے۔"

مُہرِ شاہی ثبت کر کے خط قاصد کے حوالے کیا اور خود سفر کی تیاری کے لئے محل سرا میں چلا گیا۔

مہارانی ہمایوں کے انتظار میں بڑی مستقل مزاجی سے دُشمن کا مقابلہ کر رہی تھی کہ ایک رات اچانک بُو کا پہاڑی سے دھماکے کی آواز آئی۔ جس سے ۴۵ ہاتھ فصیل اُڑ گئی اور ایک بُرج بھی ٹوٹ کر نیچے آ رہا۔ چتوڑ میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مہارانی خود مسلّح ہو کر باہر نکل آئی اور رخنے کے مقام پر توپیں رکھوا کر فوج کے ایک دستہ کو اُن کے پیچھے متعیّن کیا۔ اور انہیں مخاطب کر کے کہا،

"چتوڑ کے بہادرو! دُشمن تمہارے قلعہ کو توڑ چکا ہے۔ اَب جاں بازی کا وقت ہے۔ اگر تم نے اپنے فرض کو اچھی طرح سے انجام نہ دیا تو تمہارے مقدس شہر کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی

تمہارے بچے لاوارث ہو جائیں گے اور دُشمن تمہاری بہو بیٹیوں کی بے عزّتی کریں گے۔ اگر تم کتّوں کی موت مرنا نہیں چاہتے۔ اگر تم اپنی عورتوں کی عصمت کے پامال ہونے کا منظر دیکھنا نہیں چاہتے تو آگے بڑھو اور دُشمن کو دکھا دو کہ چتوڑ کا بچہ بچہ سنگرام اور رتن سنگھ ہے!"

اس تقریر سے راجپوتوں میں ایک ناقابلِ بیان جوش پیدا ہو گیا، اور ان کی شریانوں میں مردانگی کا خون کھولنے لگا۔ انہوں نے دُشمنوں پر اس قدر تیر برسائے، کہ وہ انتہائی کوشش کے باوجود فصیل پر نہ چڑھ سکے۔ پچھلے پہر بہادر شاہ خود اپنی خاص فوج کے ساتھ آگے بڑھا۔ مہارانی گھوڑے پر سوار ہو کر بجلی کی طرح موقعہ پر پہنچی، اور سلطان سے مخاطب ہو کر کہا :-

" اے گجرات کے بہادر جرنیل! کیا تم سنگرام کے کمسن بچے سے مظفر کی ناکامی کا بدلہ لینے آئے ہو، یا ہمارے اس احسان کا معاوضہ دینے آئے ہو، جو ہم نے محمود خلجی کو زخمی پا کر تیمارداری کی صورت میں کیا تھا! ایک کمزور عورت سے لڑنا کہاں کی مردانگی ہے، اگر شجاعت کے جوہر دکھانے ہیں تو کسی بڑے بادشاہ سے لڑو، مجھ غریب بیوہ سے لڑ کر کیا لوگے؟"

یہ کہہ کر شمشیر علم کر کے دشمنوں پر ٹوٹ پڑی۔ رانی جواہر بائی نے جب مہارانی کو نرغے میں پھنسا دیکھا، فوراً ہتھیار لگا، گھوڑے پر سوار ہو، مہارانی کے عقب میں جا پہنچی۔ اور جوشِ فدویت میں تلوار چلاتی، دشمنوں کو گراتی بڑھتی چلی گئی۔ اس نے مہارانی کو تو خطرے سے بچالیا، مگر خود اس پر ایک گجراتی سپاہی نے ایک تیر ایسا کھینچ مارا کہ اس بہادر خاتون کے سینہ میں ترازو ہو کر رہ گیا، اور شجاعت و تہور کی وہ دیوی "آہ" کہہ کر نیچے گر پڑی۔۔۔ مہارانی بے تاب ہو کر پلٹی، اور سرعت سے اس شہیدۂ وطن کے نیم جان لاشہ کو ہاتھوں پر اٹھالیا۔ جواہر بائی نے نیم وا آنکھوں سے مہارانی کو دیکھا۔ کہا:۔

"شکر ہے کہ حق ادا ہو گیا!"

پھر مسکرا کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

مہارانی کرنا رتھ جواہر بائی کے کریا کرم سے فارغ نہ ہونے پائی تھی کہ غربی جانب سے ایک برج کے گرنے کی آواز آئی۔ توپ خانے کا ترکی افسر نہایت سرگرمی سے فصیل اڑانے میں مصروف تھا مہارانی نے بوندی کے راجہ صاحب کو ایک بڑی جمعیت کے ساتھ

اس طرف روانہ کیا اور خود شاہ بُرج پر چڑھ کر ہمایوں کا راستہ دیکھنے لگی۔ مگر نگاہیں تھک کر گر پڑیں اور اُمید کا وہ ستارا جو افق پر سے چمک چمک کر چتوڑ باسیوں کو فتح و نصرت کا پیغام دے رہا تھا۔ گجراتی گھٹاؤں میں چھپ گیا۔ مہارانی کے قدم یاس و قنوط سے سو سو من کے ہو گئے ایک آہِ جگر دوز کھینچ کر کہا — "افسوس! دہلی کے شہنشاہ کو دیر ہو گئی اب زیادہ انتظار فضول ہے!"

مہارانی خادمہ کے سہارے سے نیچے اُتری۔ یہاں قاصد شہنشاہ ہند کا جواب لئے کھڑا تھا۔ مہارانی نے خط پڑھا، مگر اب اُسے مایوسی ہو چکی تھی۔ قاصد کے بیان کے بموجب شہنشاہ کے آنے میں ہفتہ بھر کی دیر تھی، مگر یہاں ایک دن کی بھی اُمید نہ تھی، فصیل چھلنی ہو چکی تھی۔ بُرج منہدم ہو چکے تھے۔ اہلِ لشکر خستہ و خوار اور زخموں سے نڈھال ہو رہے تھے۔ اس لئے کنور باگ جی کو طلب کر کے اسے راجہ دیول بنایا اور خود جوہر کی رسم ادا کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔

پہلے قیمتی مال و اسباب کو جلا دیا گیا، تاکہ دُشمن کے ہاتھ نہ لگے پھر شہر کے بڑے مندر میں پُوجا کے لئے گئی۔ چتوڑ میں جیو ہار کے لئے راجہ دیول کی طرف سے اعلان ہو چکا تھا۔ کم و بیش تیرہ ہزار عورتیں اور لڑکیاں حفظِ ناموس کے لئے جل مرنے کو آمادہ ہو گئیں۔ شہر کا شہر

مندر کو الٹ پڑا۔ دیر تک گھنٹے بجتے رہے۔ کبھی کبھی پجاری ناقوس بھی بجا لیتے تھے۔ اس کے بعد یہ تمام عورتیں اس تہ خانے میں داخل ہو گئیں جس کے نیچے بارود بچھ رہا تھا۔ مہارانی ایک بار پھر شاہ برج پر چڑھی کہ شاید شہنشاہ دہلی کا لشکر آ رہا ہو، مگر وائے ناکامی ع

تھک کے گر پڑی نگہ انتظار آج!

مایوس ہو کر واپس آئی۔ شہر کے جملہ اکابر امرا، مہارانی کے آخری درشنوں کے لئے صفیں باندھے کھڑے تھے۔ مہارانی سب کو محبت سے پرنام کرتی ہوئی تہ خانے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ یہاں اپنے کمسن بچے رانا اودے سنگھ کو کلیجہ سے لگا کر آخری پیار کیا۔ پھر اُسے راجہ صاحب بوندی کے حوالے کر کے کہا:۔

"یہ میری نشانی بھگوان اور آپ کے سپرد ہے۔ اگر اس پر کچھ آنچ آئی تو سنگرام کا نام و نشان دُنیا سے مٹ جائے گا!"

اس کے بعد فوراً دروازہ بند ہو گیا۔ راجہ دیول نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے بارود کو آگ دکھائی۔ ایک ہولناک دھماکے کی آواز آئی۔ جس سے تہ خانے میں آگ لگ گئی۔ شعلے اُٹھ اُٹھ کر آسمان سے باتیں کرنے لگے اور آن کی آن میں چتوڑ کی تیرہ ہزار عصمت مآب دیویاں جل کر راکھ ہو گئیں!

اب راجہ دیوَل نے دروازے کھلوا دیئے۔ اور زعفرانی لباس پہن کر شیرِ غرّاں کی طرح دُشمن پر حملہ آور ہُوا۔ جدھر رُخ کرتا صفوں کی صفیں اُلٹ کر رکھ دیتا۔ آخر بڑی جاں بازی کے بعد یہ بہادر سپہ سالار بھی دادِ شجاعت دیتا ہُوا مارا گیا۔ اور ساتھ ہی اس کی فدا کار فوج بھی مردانگی کے جوہر دکھا کر ٹھنڈی ہو گئی۔

سلطان بہادر شاہ فتح و نصرت کے شادیانے بجواتا اندر داخل ہُوا، مگر یہاں کیا دھرا تھا۔ ہر طرف بہادر راجپوتوں کی خُون میں نہائی ہوئی لاشیں زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ دُوسروں کی غلامی سے موت اچھی ہے۔ یا چند ٹوٹے پھُوٹے محلّات تھے، جو حیرت سے مُنہ کھولے ظفریاب لشکر کو درسِ عبرت دے رہے تھے۔

چتوڑ میں تو اتنا کچھ ہو گیا۔ اُدھر ہمایوں گھٹا کی طرح دریاؤں اور پہاڑوں پر سے اُڑا چلا آتا تھا۔ مگر جب چتوڑ کے قریب پہنچا، تو اُسے معلوم ہُوا کہ معاملہ ختم ہو چکا، اور راکھی بند بہن اس کا انتظار کرتے کرتے سوَرگ جا پہنچی۔ آنکھیں نمناک ہو گئیں اور کہا :-

"افسوس! تیمور کا پوتا اپنی ہندو بہن سے سُرخرو نہ ہو سکا!"

پھر کہا ـــــــ " اچھا، میں اِس دھبےّ کو بہادر شاہ کے خُون سے دھوؤں گا!"

یہ کہہ کر بہادر شاہی فوج کا محاصرہ کر لیا، مگر وہ تاب نہ لاکر بھاگ گیا۔ شہنشاہ نے چمپانیر، کمبوجا اور دیو پور تک اس کا تعاقب کیا۔ وہاں سے بہادر شاہ ایسا روپوش ہوا کہ پھر اس کا نشان تک نہ ملا۔

ہمایوں چتوڑ واپس آیا۔ اودے سنگھ کو طلب کر کے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور بکرماجیت کو گدی نشین کر کے دہلی کو لوٹ گیا۔ کہتے ہیں کہ ہمایوں زندگی بھر رانی کرناوتی کے جل جانے پر افسوس کرتا رہا!

پان کی گلوری

"شیر شاہ کی نظر میں معمولی بنیا ہو یا ولی عہدِ سلطنت عادل! دونوں کی عورتیں برابر ہیں۔ اگر بنیئے کی بے عزّتی کرتے ہوئے عادل کو شرم نہیں آئی تو شیر شاہ بھی اپنی بہو کی بے حُرمتی برداشت کر سکتا ہے!"

(شیر شاہ سوری)

آگرہ کے جاہ وجلال کا زمانہ تھا، دارالخلافہ ہونے کے سبب، نہ صرف شہر کی وسعت اور رونق منتہائے کمال کو پہنچی ہوئی تھی بلکہ ہندوستان بھر کے راجاؤں اور امیروں نے بھی جمنا کے کنارے دُور دُور تک عالی شان کوٹھیوں کا سلسلہ قائم کر دیا تھا۔ بابری محلّات اور باغات نے اس خطۂ ارضی کو "بہشتِ بریں" کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اگرچہ اس وقت تختِ سلطنت پر سلطان المعظم شیر شاہ سُوری رونق افروز تھے۔ اور اگر وہ چاہتے تو مغل عمارات منہدم کر کے ان کا نام ونشان تک مٹا دیتے، مگر انہوں نے ایسا نہ کیا کیونکہ وہ محض رقابتی جوش میں ایسی حسین عمارات کو ضائع نہ کرنا چاہتے تھے جو ایرانی اور افغانی آرٹ کا بے مثل نمونہ تھیں، بلکہ انہوں نے ان باغات اور محلّات میں مرمریں عمارات کا مزید اضافہ کیا۔ رعایا کی سہولت کے لئے آگرہ سے بنگال، پشاور، جودھپور، چتوڑ اور ملتان تک بڑی وسیع اور پختہ سڑکیں

تعمیر کرائیں، اور ان کے دونوں اطراف میں آم اور کھرنی کے درخت لگوائے کہ مسافروں پر سفر "حضر" بن گیا۔ پشاور سے بنگال تک لوگ ان درختوں کے سایہ سایہ چلے جاتے۔ معلوم یوں ہوتا کہ گویا وہ کسی باغ کی گلگشت کر رہے ہیں۔ مزید برآں سڑکوں پر دو دو کوس کے فاصلہ سے ایک ایک سرائے تعمیر کرادی تھی۔ ہر سرائے میں ہندوؤں، اور مسلمانوں کے لیے الگ الگ لنگر خانہ قائم تھا۔ جس وقت شہنشاہ دستر خوان پر بیٹھتا۔ نقارے پر چوٹ پڑتی اور اس کی آواز کو سن کر سراؤں کے نقارچی نوبت بجاتے اور ایک ساتھ ہی لنگر تقسیم ہونا شروع ہوتا۔ چنانچہ آدھ گھنٹہ کے اندر ہی اندر بنگال سے پشاور اور ملتان سے چتوڑ تک کے رہ نورد اپنے بادشاہ کے ساتھ کھانا کھالیتے۔ انتظام کا یہ عالم تھا کہ ایک بڑھیا زر و جواہر کا تھال سر پر اٹھائے جہاں چاہتی لئے پھرتی۔ کیا مجال کہ چور کی نیت میں فرق تک آنے پائے۔ ڈاک کا یہ حال تھا کہ بنگال یا پشاور میں کوئی واردات ہوتی تو دوسرے دن بادشاہ کے نوٹس میں آجاتی۔ غرض ان انتظاموں اور سہولتوں سے آگرہ کی رونق میں چار چاند لگ گئے، ہر طرف مرفہ الحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ اور جمنا کے لیل و نہار اتنے حسین و جمیل تھے کہ نیل اور دجلہ کو یہ ایام خواب میں بھی نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ اور آگرہ کے بازار

اور گلی کوچوں میں وہ چہل پہل رہتی کہ بغداد اور مصر بھی اس کے آگے گرد تھے۔ انہی ایام میں ایک روز شہنشاہ کا ولی عہد محمد عادل خاں اپنے جلو سمیت ہاتھی پر سوار ہو کر آگرہ کے ایک کوچہ سے گزر رہا تھا کہ راستے میں ایک کچے مکان کے اندر ایک ہندو عورت بے تکلف غسل کرتی نظر آئی۔ شہزادہ اس وقت پان سے شغل کر رہا جا رہا تھا۔ اس نے ایک گلوری اس عورت پر بھی پھینک دی اور سواری گزر کر چلی گئی۔

عورت شرم و حیا کی دیوی تھی۔ اسے برہنگی کے عالم میں جب شہزادے کی اس حرکت کا علم ہوا تو وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی اور بدحواس ہو کر خودکشی پر آمادہ ہو گئی۔ اتنے میں اس کا شوہر ہری بھی آ گیا۔ اس نے رو رو کر سارا ماجرا کہہ سنایا۔

پہلے تو اسے یقین نہ آیا کہ شہنشاہ عادل کا فرزند ہو، اور ایسی نازیبا حرکت کا ارتکاب کرے۔ مگر جب ہمسایوں کی زبانی اسے علم ہوا کہ واقعی شہزادے ہی کی سواری ادھر سے گزری ہے تو وہ غیرت سے تڑپ اٹھا اور شہزادے سے انتقام لینے پر آمادہ ہو گیا۔

بیوی کو، جو فرطِ غم سے نڈھال ہو رہی تھی، تسلی دی اور کہا

"ہمارا شہنشاہ بے حد منصف مزاج اور عادل ہے۔ اگرچہ عادل خاں اس کا لڑکا ہے، مگر مجھے پختہ یقین ہے کہ وہ کسی صورت بھی اس کی اس نامناسب حرکت کو گوارا نہ کرے گا اس لئے یہ معاملہ بادشاہ تک پہنچانا چاہیئے۔ چنانچہ ہری نے ساری رات اسی غور و فکر میں بسر کر دی کہ اس مقدمے کو کس طریقے سے شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا جائے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جب شہزادے نے میری بے عزتی کرتے ہوئے کسی قسم کا شرم و حیا نہیں کیا تو مجھے بھی موقع اور مصلحت دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ سر دربار اسے ذلیل کرنا چاہیئے۔ دوسرے دن سویرے اشنان کر، اپنی شادی کے کپڑے پہن ہری قلعے کو روانہ ہو گیا۔

شہنشاہ کا معمول تھا کہ ہر روز بلا ناغہ دیوانِ عام میں اجلاس فرماتے تھے، اور ہر خاص و عام کو دربار کی روئیداد دیکھنے کی اجازت تھی۔ قلعہ کے پھاٹک پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اس لئے فریادی بلا تکلف دیوانِ عام میں پہنچ کر بادشاہ سے بالمشافہ عرض معروض کر سکتے تھے۔ لہٰذا ہری کو بھی دربار میں باریاب ہونے کے لئے کوئی خاص دقت نہ ہوئی، اور وہ دروازے سے گزر کر بے خوف و خطر

آگے بڑھتا چلا گیا۔ دائیں بائیں رومی اور ایرانی باجے بج رہے تھے روشن چوکی کی سہاونی آواز اور نوبت کی ٹکور سے دل بے قابو ہوا جاتا تھا۔ ہزاروں سوار اور پیادے رنگدار وردیاں پہنے اور خون آشام تلواریں علم کیے جا بجا پہرے پر اِستادہ تھے۔

دیوانِ عام درباریوں اور جاں سپار فوجی لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ مگر چاروں طرف سکوت طاری اور رعب و خاموشی چھائی تھی۔ رہ رہ کر نقیب کی پُر جلال پکار اور چاؤش کی پُر ہیبت صدا گونج اُٹھتی تھی۔ تسلیمات، کورنش، بندگی، مُجرا، آداب بجا لاؤ، نظر روبرو، جہاں پناہ، بادشاہ سلامت، عالم پناہ بادشاہ سلامت!

اِس آواز سے ہری کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور مارے ہیبت کے تھر تھر کانپنے لگا۔ سامنے نگاہ اُٹھائی تو عجیب عالم نظر آیا دیکھا کہ ایک پیر مرد نُورانی شکل کے لاکھوں روپے کا قیمتی لباس پہنے اور ہیروں کا تاج سر پر دھرے عجیب متانت سے فریادیوں کی دادرسی کر رہا ہے۔

ہری کی قوّتِ گویائی نے یاوری نہ کی۔ دائیں جانب نظر دوڑائی تو بڑے بڑے راجے مہاراجے اور شہزادے ہاتھ باندھے سنّاٹے

کے عالم میں گردن جھکائے نظر آئے۔ بائیں جانب نگاہ کی تو ناظر چوبدار سونے چاندی کے عصا تھامے نظر پڑے۔ ہری نگاہِ حیرت سے اس نظارہ کو دیکھ رہا تھا کہ ایک چوبدار کی آواز نے چوکنا کر دیا۔

"کیوں بھائی! جہاں پناہ سے کچھ عرض کرنا ہے؟"

"ہاں حضور! میں شہنشاہ کی خدمت میں ہی فریاد لے کر حاضر ہوا ہوں!"

"تب اِدھر آؤ!"

یہ کہہ کر چوبدار ہری کو فریادیوں کے جرگہ میں لے آیا۔ باری باری ایک ایک فریادی بادشاہ کی خدمت میں پیش ہو رہا تھا۔ جہاں پناہ خود بیان سماعت فرماتے اور ایسا فیصلہ صادر کرتے کہ فریادی باغ و بہار ہو جاتا۔

ہری جان بوجھ کر پیچھے ہٹا کھڑا رہا۔ کیونکہ اس کا معاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ اس کے لئے شہنشاہ کی کامل توجہ درکار تھی۔ چنانچہ اخیر میں وزیرِ اعظم نے اسے بھی گزارش کرنے کے لئے تخت کے روبرو لا کھڑا کیا۔ ہری نے شہنشاہ کے باوقار اور پُرجلال چہرے کو دیکھا، تو تعظیم کے لئے جھک گیا۔ اور تخت کی زمین کو بوسہ دینے کے بعد پان کی گلوری وزیرِ اعظم کے آگے رکھ دی۔

وزیرِ اعظم نے بعینہٖ اُسے اُٹھا کر شہنشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔
بادشاہ نے تعجب سے گلوری کو دیکھا اور فرمایا:-

"بیٹا! کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ہری رعبِ شاہی سے لرز اُٹھا۔ اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا:-

"مائی باپ......"

اور پھر اس کی زبان بند ہو گئی۔

"ہاں! ٹھیک ہے! بادشاہ رعایا کا باپ ہی تو ہوتا ہے۔ بولو! ڈرو نہیں۔ یہ گلوری کیسی ہے۔ اور اس کے پیش کرنے سے تمہارا کیا مدّعا ہے؟"

ہری سنبھلا اور سنبھل کر نہایت مرتعش آواز میں بولا:-

"عزّت کا معاملہ ہے اور عزّت ہر ایک کو پیاری ہے عالم پناہ!"

"کیوں! کسی ظالم نے تمہاری عزّت پر حملہ کیا ہے؟ بتاؤ وہ کون مردود ہے؟" شیر شاہ نے گھور کر کہا

"جہاں پناہ کا اقبال قائم رہے۔ نام لینے میں ادب مانع ہے!"

ہری نے ادب سے سینہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔

"پرواہ نہیں، شیر شاہ کی نگاہ میں ارا کینِ شاہی سے معمولی خدّام

تک سب برابر ہیں۔ اگر تم سچے ہو تو ملزم کو قرار واقعی سزا ملے گی!"

"حضورِ والا! ــــ سائل کا ملزم جہاں پناہ کا ولی عہد شہزادہ عادل خاں ہے۔"

"عادل ــــ! کیا کیا اُس نے؟" بادشاہ نے تیوریوں پر بل چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ظل اللہ! میری بیوی اپنے مکان کے صحن میں نہا رہی تھی۔ پاس سے شہزادے کی سواری گزری۔ ہاتھی پر سوار تو تھے ہی۔ مکان میں نگاہ پڑ گئی۔ حضور کی لونڈی کو جو دیکھا، پان کی یہ گلوری پھینک دی۔ عالی جاہا! شرم و حیا کی وہ دیوی کل سے زار زار رو رہی ہے۔ شرم سے خودکشی کرنا چاہتی تھی کہ میں نے بڑھ کر روکا۔ اور یہ گلوری حضور کی خدمت میں لے آیا۔ طالبِ انصاف ہوں۔"

ہری کے اس بیان کی سماعت سے بادشاہ کی آنکھیں شعلۂ جوالہ بن گئیں۔

"عادل کو حاضر کرو!" بادشاہ نے حکم فرمایا۔

دربار میں ایک سناٹا چھا گیا۔ ملازمینِ شاہی کل کی پتلی کی طرح حکم کی تعمیل میں لگ گئے اور شہزادہ ڈرتے کانپتے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ بادشاہ نے شہزادے کے چہرے پر غصہ بار نظریں گاڑ کر کہا:-

"کیا تمہیں اس وقت حاضرِ دربار ہونے کی وجہ معلوم ہے؟ اگر نہیں تو سن! تمہیں اس لئے طلب کیا گیا ہے کہ تیری زبان سے اپنی محبوب رعایا کی بے عزتی اور بے حرمتی کا واقعہ سنوں۔ تو اس وقت شیر شاہ کا فرزند نہیں، بلکہ قوم اور ملک کا غدار ہے۔ قبل اس کے کہ ماہدولت تمہیں عبرتناک سزا دیں۔ بول تو عذر میں کیا پیش کرنا چاہتا ہے؟"

عادل خاں سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ مگر جلد حواس جمع کر کے سنبھلا اور سنبھل کر بولا :-

"عالم پناہ! یہ غلام کسی ایسے فعل کا مرتکب نہیں ہوا جس سے جامۂ شاہی داغ آلود ہوا ہو، واقعہ یہ ہے کہ مستغیث کی اہلیہ اپنے مکان کے صحن میں آزادانہ طور پر نہا رہی تھی۔ میں نے محض اس لئے گلوری پھینک دی کہ اُسے غیر کے دیکھنے کا علم ہو جائے، اور آئندہ وہ نہانے میں ایسی بے پرواہی سے کام نہ لے، ورنہ خدا شاہد ہے کہ بندہ کی نیت ہرگز بری نہ تھی!"

"عادل! تیرا بیان اگرچہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو، لیکن اس سے دوسروں کی تسلی نہیں ہو سکتی۔ تم خائن ہو، ظالم ہو اور سزا کے مستحق ہو!"

وزیر اعظم موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے آگے بڑھے، لیکن قبل اس کے کہ اس کی زبان سے ایک حرف نکلتا۔ بادشاہ نے پُر ہیبت انداز

میں کلامِ الٰہی کی یہ آیت تلاوت کی :۔

"جب کہو، انصاف کی بات کہو، چاہے کسی قربت دار ہی کو نقصان کیوں نہ پہنچے!" (قرآن مجید)

اس پر وزیر کو کچھ کہنے سُننے کی جرأت نہ ہو سکی۔ غصّے کا یہ عالم دیکھ کر شہزادہ بھی مبہوت ہو گیا۔ وہ بادشاہ کی شعلہ بار آنکھوں کو خوف و ہراس سے دیکھنے لگا۔ بادشاہ کا غصہ لحمہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔

"جواب دو! تمہیں اس بیہودہ پن کی کیا سزا دی جائے؟"

عادل خاں نے اس طرح آہستگی سے جواب دیا جس طرح تپِ دق کا مریض آخری سانس لیتا ہو، اور وصیّت کے چند آخری الفاظ کہہ رہا ہو :۔

"عالم پناہ! یہ غلام اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے۔ معافی دی جائے، آئندہ ایسی غلطی نہ ہو گی!"

عادل خاں کی اس عاجزانہ استدعا نے شیر شاہ کے دل پر اثر کرنے کی بجائے اس کے رخشِ غضب پر مہمیز کا کام کیا۔ وہ فرطِ غیظ سے کانپنے لگا۔

"تجھے معافی دے دوں! آج تو تجھے اتنی جرأت ہوئی ہے کہ دُوسروں کی بہو بیٹیوں پر گلوری پھینکی ہے اور کل کو تُو اتنا دلیر ہو جائے

کہ اٹھوا کے اپنے ہودج میں بٹھالے، اور پھر تیری دیکھا دیکھی حکومت کے دوسرے امراء اور وزراء بھی ایسی کمینہ حرکتیں کرنے لگ جائیں اور میرا مُنہ آخرت میں سیاہ ہو!"

تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد بادشاہ پھر گویا ہوا:۔

"کیا خداوندِ عالم نے ہاتھی کی سواری تجھے اس لیے بخشی ہے، کہ تُو غریبوں کے کچے مکانوں کے پاس سے گزر کر ان کی بے پردگی کرے اور ان کی آبرو پر حملہ کرے!—— کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہاری عزّت قیمتی ہے اور غریب رعایا کی عزّت کی کوئی قیمت نہیں!"

اب بادشاہ کا دامنِ صبر و ضبط چاک چاک ہو گیا۔ اُس نے اتنے زور سے چلّا کر کہا کہ آواز پھٹ گئی اور مُنہ سے کف نکلنے لگا:۔

"بے عزّتی کا بدلہ بے عزّتی سے لیا جائے گا۔ شیر شاہی انصاف یہ چاہتا ہے کہ اب تم اپنی بیوی کو ہرّی کے مکان پر بھیج کر کہہ دو کہ وہ بھی اسی صحن میں جا کر نہائے۔ میں ہرّی کو تیرے ہاتھی پر سوار کر کے بھیجتا ہوں۔ جب یہ تیری بیوی پر پان کی گلوری پھینک لے گا اُس وقت شیر شاہ کا انصاف پورا ہو جائے گا۔"

اس فیصلے نے شہزادے کی حمیّت کو بیقرار کر دیا۔ خون گرم ہو کر رگوں میں سُرعت سے دوڑنے لگا۔ آنکھیں پُر آب ہو گئیں اور جسم میں

کپکپی سی پیدا ہو گئی۔ تخت کے سامنے دو زانو ہو کر ترحم طلب انداز میں بولا :۔

"عالم پناہ کو اگر عادل کی بے عزتی کا تماشا دیکھنا مقصود ہے تو یہ غلام حاضر ہے۔ اس کی بے وقری سے بادشاہ کی تمنا اور آرزو پوری ہو سکتی ہے۔ بھرے دربار میں بندہ کے کوڑے لگوا کر اپنی آتش غضب کو فرو کر لیجیے، مگر اے تاجدارِ ہند! میری بیوی رعایا کے محبوب بادشاہ کی بھی کچھ لگتی ہے، اور وہ عفیفہ اس معاملہ میں مطلقاً بے قصور ہے۔ اُسے بے عزت نہ کیا جائے۔"

اپنی عزت کا درد آرہا ہے! میں بادشاہ ہوں، میرے حکم کو کوئی روکنے والا نہیں۔ تم کہتے ہو کہ عادل کی اہلیہ شیر شاہ کی بھی کچھ لگتی ہے۔ سُنو! شیر شاہ کی نظر میں غریب بنیا ہو یا ولی عہدِ سلطنت عادل دونوں کی عورتیں برابر ہیں۔ اگر بنیئے کی بے عزتی کرتے ہوئے عادل کو شرم نہیں آئی تو شیر شاہ بھی اپنی بہو کی بے حرمتی برداشت کر سکتا ہے۔ جاؤ میرے حکم کی تعمیل کرو!"

ہری نے جب بادشاہ کا یہ فیصلہ سُنا تو فرطِ مسرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ گلوگیر آواز میں بولا :۔

"عالم پناہ! بس، میں نے انصاف پا لیا۔ خدا حضور کو سلامت رکھے

جیسا سُنا تھا، ویسا ہی پایا۔ اب شہزادی صاحبہ کو وہاں جانے کی ضرورت نہیں!"

بادشاہ نے دل سوزی سے ہرّی کی طرف آنکھ اٹھا کر نظر کی اور فرمایا:۔

"میرے مظلوم بچے! ایسا نہ کرو۔ جس ہمّت اور دلیری سے داد خواہ ہوئے ہو، اسی استقلال سے انتقام بھی لو۔ تاکہ آئندہ کسی شہزادے یا امیر کبیر کو ایسی جسارت نہ ہو!"

ہرّی نے تخت کو چومتے ہوئے عرض کی:۔

"ظل اللہ! جہاں تک شہزادے کے قصور کا تعلق تھا۔ انہیں کافی سزا مل گئی ہے۔ مگر خدا مجھے اُس دن کے لئے زندہ ہی نہ رکھے، کہ ناموسِ شاہی کی اس طرح بے حرمتی ہوتی دیکھ سکوں!"

بادشاہ نے شہزادے سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"سُنتے ہو عادل! لوگ بادشاہوں کو اپنا ماں باپ سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں بھی ان سے وہی سلوک کرنا چاہیئے جو ماں باپ اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔ جاؤ، فریادی سے معافی مانگو جس نے فیاضی سے کام لے کر تجھے بے آبرو ہونے سے بچا لیا۔ ورنہ تو قیامت تک کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔"

عادل خاں نے انتہائی ندامت سے ہری سے مخاطب ہو کر کہا۔
"دوست! میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے تم سے معافی مانگتا ہوں، اور اقرار کرتا ہوں کہ تمہاری بیوی میری بہن ہے اور میں عمر بھر اس سے وہی سلوک کروں گا جو بھائی بہنوں سے کیا کرتے ہیں"۔
یہ دیکھ کر بادشاہ کا غصہ فرو ہو گیا اور اس کے چہرے پر تبسم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خزانچی سے فرمایا کہ ہری کو خزانے میں لے جاؤ اور زر و جواہرات سے مالا مال کر دو۔ چنانچہ ہری کو خزانہ شاہی سے اس قدر انعام و اکرام ملا کہ پشتوں تک اُس کی اولاد عیش کرتی رہی اور عادل خاں بھی جب تک زندہ رہا، ہر تہوار پر ہری کے گھر وہ تحفے تحائف بھیجتا جو عام طور پر بھائی اپنی بہنوں کو بھیجا کرتے ہیں۔

O

کوٹ نورنگ کی تباہی

"اے نیک بخت! نورنگ خاں نے تجھ سے ایک جھونپڑا چھینا تھا۔ میں نے اس سے یہ سارا شہر چھین لیا۔ اُس نے تیرا ایک مکان گرایا تھا، مگر دیکھ! — میں اس کے فلک بوس محلات سے کیا سلوک کرتا ہوں!"

(نواب محمد شجاع)

ضلع ملتان میں کوٹلی نجابت کے قریب کوٹ نورنگ کے کھنڈرات ملتے ہیں۔ محمد شجاع خاں کے دورِ حکومت میں یہاں ایک خوبصورت شہر آباد تھا، جو ۱۷۷۴ء میں اچانک منہدم کرا دیا گیا۔ یہ داستان اسی کے گرد گھومتی ہے!

سازش

سُورج طلوع ہو چکا تھا۔ اس کی زرد زرد کرنیں کوٹ نورنگ کے محلّات کو سنہری خلعتیں پہنا رہی تھیں۔ ایّن شہر کا مشہور بدمعاش اپنے مکان کے باہر نصیر کے ساتھ بیٹھا حُقّہ پی رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ جلال پور کی سڑک پر دوڑ گئی۔ آنکھوں کے گرد اپنے ہاتھوں سے ہالہ بناتے ہوئے نصیر بولا۔ "دیکھنا کہیں یہ راموں اور اس کی ماں تو نہیں جا رہے ہے!"

"معلوم تو وہی ہوتے ہیں!" نصیر نے سرگوشی کرتے ہوئے جواب

دیا۔

ابّن نے حقّہ نصیر کو پکڑوا دیا اور بڑبڑاتے ہوئے اُٹھا۔ تخت کے نیچے سے جوتا نکالا۔ ایک دو دفعہ زمین پر جھاڑ کر اس کی خاک دھول صاف کی اور پہن کر راموں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔

"کہاں جاتے ہو بھیّا!" نصیر نے کش لگاتے ہوئے کہا۔

"ذرا اِدوانی تک جا رہا ہوں۔ ابھی آیا۔ ہاں ذرا نھّو کو بھینس نکال دینا۔ بیچاری رات سے بھوکی ہے!"

ابّن لمبے لمبے ڈگ بھرتا راموں کے قریب جا پہنچا۔ بڑھیا کمر پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ کچھ بہرہ پن اور کچھ جوتے کی چیخ پخ وہ کسی خیال میں کھوئی ہوئی ایک ہی رفتار سے جا رہی تھی۔ البتہ راموں اِدھر اُدھر دیکھتا اور راستے کے کنکروں کو پاؤں سے کِک (Kick) لگاتا اُچھلتا کودتا جا رہا تھا۔ ابّن کو آتا دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"کدھر جا رہے ہو ابّن چچا؟" راموں نے مسکرا کر کہا۔

"میں یہیں کوٹ سدھا تک! ــــ تم کہاں چلے ہو؟" ــــ ابّن کی نگاہیں بڑھیا کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"ہم!..... ہم.....!!" راموں نے انگلی سے سینے کو چھوتے ہوئے ابّن کی جانب نگاہ اٹھائی۔

"ہاں، ہاں تم!" ابنّ نے کھلکھلا کر کہا — "تو گویا میں کسی دُوسرے سے مخاطب ہوں —؟"

رامون معصومانہ شرارت سے ہنسا۔ "چچا، ہم "ٹھٹھہ گھلوال"[1] جا رہے ہیں، اور کچھ "ردم شام" میں بھی کام ہے۔

اتنے میں بڑھیا نے مڑ کر دیکھا۔ ابنّ نے آگے بڑھ کر کہا:-

"ماں! سویرے سویرے کہاں چلی ہو —!"

بڑھیا رُک گئی۔ اُوپر نیچے گھُور کر دیکھا "کون! — ابنّ بیٹا!!" خوشی سے بڑھیا کی باچھیں کھِل گئیں۔ لعابِ دہن کو چوستے ہوئے سر کو اوپر اُٹھایا۔ گویا ابنّ کو اپنی رام کہانی سنانے سے پہلے خود اس سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔

"میں رامون کو لے کر اس کے ماموں کے پاس جا رہی ہوں بیٹا!"

"اچھا! ہری ملک کے پاس!"

"ہاں بھائی! — کچھ سُنا تم نے! خان نے میرا مکان چھین لیا" بُڑھیا نے وفورِ غم سے گلوگیر ہو کر کہا۔

ابنّ سب کچھ جانتا تھا، مگر اس وقت تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے حیرت و استعجاب میں ڈوبی ہوئی آواز سے بولا:-

"ہیں —! کب اور کیوں —؟"

---

[1] موضع رسول پور کا ایک گاؤں

بڑھیا نے لاٹھی پھینک دی اور سڑک سے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ کر ایک دو گرم گرم قطرے آنکھوں سے گرائے۔ کہا:-

"بیٹا! تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ میرا مکان خان کے محل کے قریب پڑتا تھا۔ ایک دن خان نے مجھے محل میں بلایا۔ کہا:—

—"نیک بخت! ہم محل کے قریب کچہری کی عمارت بنانا چاہتے ہیں اگر اپنا مکان دے دو تو ہم منہ مانگا انعام دیں گے"— میں نے کہا۔ نواب صاحب! تم جانتے ہو، میرے داموں کی یہی پونجی ہے اور اس کے بڑوں کی نشانی ہے۔ خدا نے تم کو ملک دیا ہے۔ بخت اور تخت عنایت کیا ہے۔ اتنے بڑے بڑے محل بخشے ہیں۔ غریب کی جھونپڑی پر لالچ کا ہاتھ نہ بڑھا"

بڑھیا سستانے کے لئے رک گئی۔ ابن بے صبری سے بولا:-

"پھر!"

بڑھیا نے کھانستے ہوئے کہا "خاں صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے — "مائی! تیرے داموں کا کوئی رشتہ دار بھی ہے؟" — میں نے کہا۔ "ہر کی ملک، میرا سگا بھائی ہے اور وہ ٹھٹھہ میں رہتا ہے۔ وہیں اس کی نمبرداری بھی ہے"— کہا۔ "اگر تیرے مکان کا

معاوضہ ٹھٹھہ میں دے دیں تو پھر راضی ہو جائے گی ؟" — بھائی کا نام سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ دل میں سوچا۔ اگر بھائی کے پاس جگہ ملتی ہے تو پھر کیا حرج ہے۔ خان صاحب پھر مخاطب ہوئے فرمایا — "کتنی زمین لو گی ؟" — میں نے کہا — "جو سرکار کا انصاف دلا دے۔"

فرمایا — "ٹھٹھہ کے موضع میں دو سو بیگھے اراضی ہم اس مکان کے معاوضہ میں مرحمت فرماتے ہیں۔ کیوں ! راضی ہو ؟" — ارے بابا، ابّن ! اتنی بڑی زمین سُن کر خوشی سے تو میرے آنسو نکل آئے۔ کہا آپ کتنے دیالو ہیں مہاراج ! جو ایک جھونپڑی کے بدلے اتنی زمین دیتے ہیں۔ پھر رامو سے پوچھا۔ "کیوں بیٹا ! راضی ہے ؟" "مگر یہ معصوم بچہ کیا جانے کہ دو سو بیگھے کتنی بڑی زمین ہوتی ہے کہنے لگا۔ میں تو پتا جی کا مکان ہر گز نہ دوں گا۔ خواہ خان صاحب اپنا محل کیوں نہ دے دیں ! . . . . ."

رامو نے بات کاٹتے ہوئے کہا :۔

"کیوں چچا ! مکان بیچنا کوئی اچھی بات ہے ؟"

ابّن مسکرایا۔ کہا — "بیٹا ! درست کہتے ہو۔ مکان تو دِوالیے بیچتے ہیں۔ تم کوئی دِوالیے ہو !"

بڑھیا نے آنسو پونچھتے ہوئے ابن کو پھر مخاطب کیا:۔

"بس بیٹا! میں نے تو انکار ہی کر دیا۔ مگر میرے انکار سے کیا بنتا تھا بڑے آدمیوں سے پالا نہ پڑے۔ ایک دن ہم ماں بیٹا، کوٹلی نجابت میں چودھری گردھاری رام کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو مکان کا پتہ تک نہ تھا۔ نورنگ خاں نے روڑے کنکر تک اٹھوا لئے تھے۔ جہاں میں نے شباب کی ہزاروں پر لطف گھڑیاں گزاری تھیں۔ آج اُس کا نشان تک نہ تھا۔ وہ سُندر مکان جو میرے سورگباشی پتی کی یادگار تھا جس میں میرا رامو پیدا ہوا۔ جہاں میرے پتی نے اپنی آتما پرماتما کے حوالے کی۔ آج ہمیشہ کے لئے مٹ چکا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ خان کے آدمی میرے انتظار میں تھے۔ خان کو اطلاع کی۔ وہ بڑی شان سے تسبیح ہاتھ میں لئے باہر نکل آئے۔ کہا۔

"مائی! تیری خواہش کے مطابق ہم نے ٹھٹھہ گھلواں میں دو سو بیگھے اراضی رامو کے نام لکھ دیئے ہیں۔ تمہارا سامان دیوان خانے کے کمرے میں موجود ہے۔ اٹھوا کر لے جا اور بھائی کے پاس آرام سے زندگی بسر کر!"

میں روئی اور بے اختیار روئی۔ میرا رامو بھی سسکیاں بھر کر روتا رہا۔ خان نے ہزار تسلّی دی، مگر ہمارا غم ہلکا نہ ہوا۔ میں نے کہا:۔

"نواب صاحب! آپ نے دولت کے گھمنڈ میں مجھ غریب کا مکان گرادیا۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ ایک بیوہ کی آہ اور یتیم کی فریاد رنگ لائے بغیر نہ رہے گی۔ میں روتی ہوئی باہر چلی آئی۔ اب ہرتی کے پاس جا رہی ہوں کہ وہ آکر ہمارا سامان لے جائے!"

ابن نے بظاہر بہت افسوس کیا اور کہا — "ہاں! پٹھانوں کا حوصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ آج تمہارا مکان چھینا ہے۔ کل میرا اگڑ کھنگڑ باہر نکال پھینکیں گے۔"

اب بڑھیا ذرا سنبھلی اور سنبھل کر بولی۔

"ہاں یہ تو بالکل درست ہے۔ اگر راموں کا مکان چھینا جا سکتا ہے، تو ابن اور نصیر کس باغ کی مولی ہیں!"

ابن ذرا قریب ہو بیٹھا۔ اور رازدارانہ طور پر بولا — "ماں! اگر میرا کہا مانے تو ٹھٹھہ کی بجائے شجاع آباد چلی جا اور نواب محمد شجاع خاں کو جاکر فریاد سُنا۔ وہ بڑا منصف اور رعایا پرور بادشاہ ہے، اگر نورنگ خاں کو کچا نہ چبا جائے تو میرے مُنہ پر تھوکنا!"

بڑھیا کے چہرے پر تبسّم پھیل گیا

"کیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو ابن!"

"خدا قسم ایمان سے۔" ابن نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

بڑھیا نے لاٹھی اُٹھالی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھی۔ کہا "بس آج ہی داموں کو لے کر سیدھی شجاع آباد جاتی ہوں۔ مکان تو واپس آ نہیں سکتا۔ مگر کلیجہ تو ٹھنڈا ہو سکتا ہے۔"

بڑھیا کمر پر ہاتھ رکھے، جُوتی چٹخاتی آگے کو روانہ ہوئی مگر جلال پور کی سڑک پر نہیں، بلکہ اس بڑی شاہراہ پر جو دُنیا پور سے شجاع آباد کو جاتی تھی۔ ابن کچھ دیر کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ پھر "رُوانی" کو چل دیا۔

اسے نورنگ خاں سے یہ رنج تھا کہ جب سے یہ شہر آباد ہُوا تھا، اُسے لوٹ مار کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ایک آدھ دفعہ چوری کے جُرم میں خانِ اعظم سے سزا بھی پا چکا تھا۔ اب یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح خانِ اعظم یہاں سے واپس شجاع آباد چلا جائے۔ تاکہ حسبِ دستور پھر لوٹ مار کر سکے۔

نواب محمد شجاع خاں کے عدل و انصاف کا دُنیا بھر میں شہرہ تھا وہ مظلوم کے لئے ہی "شجاع" نام لے کر پیدا ہُوا تھا۔ اس لئے کسی شخص کو جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ کسی حقیر سے حقیر شخص پر آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

ابن کو اُمید تھی کہ اگر بڑھیا اس کے دربار میں چلی گئی تو نورنگ خاں آسانی سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔ اس لئے وہ صبح سویرے

اپنے کئی کام چھوڑ کر اس کے تعاقب میں بھاگا تھا۔

شجاع آباد

شجاع آباد کوٹ نیرنگ سے چودہ میل پڑتا تھا۔ اگر انتقام کا جوش بڑھیا کی شریانوں میں خون کو نہ گرما دیتا تو غالباً وہاں تک پہنچنے کی اُسے ہمت نہ ہوتی۔ باوجودیکہ سواری میسّر نہ تھی اور کوئی ساتھی بھی ہمراہ نہ تھا، لیکن بڑھیا نے حوصلہ نہ ہارا۔ دونوں چلتے رہے رات بستی نون میں پڑی اور دوسرے دن دوپہر کو نالہ گجو ہٹہ کے پُل پر تھے۔ بڑھیا نے بڑبڑا کر کہا:۔

"یہ نالہ بھی ابھی بنا ہے؟"

چند قدم آگے چلے تھے کہ ڈاموں حیرت سے چلّا اُٹھا:۔

"آہا! شہر آ گیا۔ ماں! دیکھو تو سہی، کتنا سُندر اور کتنا بڑا شہر ہے۔ آخر آ ہی گئے نا!"

بڑھیا نے چہرے کی خاک دُھول دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے کہا:۔

"ہاں، دیکھو بڑی چستی سے جواب دینا۔ بادشاہ بڑا عادل ہے۔ غریبوں کی خوب سُنتا ہے" بڑھیا نے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ایسا جواب دوں گا کہ نواب کانپ اُٹھے گا!"

"بھلا کیا کہو گے؟" بڑھیا رُک گئی اور گھور گھور کر لڑکے کو دیکھنے لگی۔

"میں کہوں گا — راجن! میرا انصاف کر، میں یتیم ہوں لاوارث ہوں۔ میری ماں بھی بڑھیا ہے۔ ہمارا کوئی سہارا نہیں۔ لیکن تو جانتا ہے کہ جس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ اس کا سہارا خود خدا بن جاتا ہے۔ — کیوں ٹھیک ہے ماں؟"

"شاباش! بہت اچھا جواب ہے!"

شہر کی عورتیں گھاٹ سے نہا دھو کر شہر کو لوٹ رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ دونوں بڑھتے چلے گئے۔ کہیں کہیں راموں نوابزادوں کی خوشنما کوٹھیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ٹھہر جاتا تھا۔ بڑھیا چند قدم چل کر رُک جاتی اور جب راموں آجاتا، تب آگے چلتی۔ شہر کی کوہ وقار فصیل کے قریب پہنچے تو اس کے باہر کی طرف چوڑی خندق پانی سے بھری ہوئی نظر پڑی۔ بڑھیا نے راموں کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا — "دیکھنا، اس کے قریب نہ جانا، یہ بہت گہری ہے ہر وقت اس میں نہر گجھ ہٹہ سے پانی آتا رہتا ہے۔ اس لئے پانی ہمیشہ صاف ستھرا رہتا ہے" — بڑھیا یہ کہہ کر سر بفلک دروازے کی

طرف لپکی اور بازار سے گزرتی ہوئی چوک میں جا پہنچی۔ یہاں رُک کر رامُوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ چاروں دروازے صاف نظر آ رہے تھے۔ بازاروں میں اتنی بھیڑ تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ دُکانیں خوب آراستہ تھیں۔ درمیان میں ایک جانب سبزمنڈی تھی مغرب کی طرف کپڑوں کی دُکانیں تھیں۔ شمال کی سمت شہر کی جامع مسجد اور حلوائیوں کے خوانچے لگے تھے۔ بڑھیا نے دامن سے دونّی کھول کر رامُوں کو رنگتر ے لے دیئے۔ یہاں سے بُڑھیا نے دربار کا پتہ دریافت کیا۔ ایک پیر مرد نے آگے بڑھ کر کہا:۔

"آ بہن! میں تجھے سرکار کی کچہری میں پہنچا دوں!"

بڑھیا دُعائیں دیتی ساتھ ہو لی۔ کچھ دُور جا کر ایک عالی شان عمارت آئی یہاں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ پیر مرد نے کہا:۔

"یہ نواب صاحب کا دربار ہے۔ دروازے سے گزر کر اندر چلے جاؤ، چوبدار تمہیں خود بخود سرکار کی خدمت میں پیش کر دے گا!"

نواب کا دربار

بُڑھیا نے دروازے سے گزر کر اِدھر اُدھر جھانکا۔ لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ رامُوں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولی:۔

"دیکھو بیٹا! اتنی بھیڑ میں ہماری کون سنتا ہے۔ ذرا قریب لگ کر بیٹھ جاؤ۔ جب ذرا ہجوم کم ہوگا۔ تب آگے چلیں گے!"

ایک آدمی جو پاس کھڑا تھا بولا:

"مائی! اب فریادی پیش ہیں، تم بھی ساتھ ہو جاؤ۔ گھنٹہ بھر تک ظہر کی نماز کے لئے دربار برخاست ہو جائے گا اور تمہیں پھر کل کے لئے ٹھہرنا پڑے گا۔"

چوبدار شاہی نے آگے بڑھ کر رامون کا ہاتھ تھاما۔ بڑھیا سے کہا "ماں! ادھر آؤ، مردوں میں مت ٹھہرو، میں تمہیں کٹھرے کے قریب لئے چلتا ہوں۔"

نواب کی گرجدار آواز آرہی تھی۔ رامون سہم گیا۔ کہنے لگا:

"اماں! ڈر لگتا ہے!"

"ڈر کاہے کا، کوئی ہم چور ہیں!" بڑھیا نے رامون کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ چوبدار بڑھیا کی ضعیفی پر رحم کھا کر اسے نواب صاحب کے بالکل سامنے لے گیا۔

محمد شجاع خاں پچپن ۵۵ برس کا بارعب انسان تخت شاہی پر بیٹھا دادِ انصاف دے رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بے خطا کشش لوگوں کے دلوں کو موہ لیتی تھی۔ اور موٹی موٹی آنکھوں سے وہ جاہ وجلال ٹپکتا

تھا۔ کہ بڑے بڑے امراء کانپ اُٹھتے تھے۔ نواب نے کمسن داموں اور اس کی ضعیف ماں کو دیکھا تو ملائمت سے پوچھا۔

"اے بچے! بول کیا چاہتا ہے؟"

داموں نے ادب سے جُھک کر پرنام کیا، اور ادب سے بولا۔

"سرکار! میں انصاف چاہتا ہوں۔ میں یتیم ہوں، لاوارث ہوں میری ماں بھی بُڑھیا ہے۔ ہمارا کوئی سہارا نہیں۔ لیکن اے راجن! تُو جانتا ہے کہ جس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا، اس کا سہارا خود خدا بن جاتا ہے۔ اگر تُو نے میرا انصاف نہ کیا تو پھر میرا اور تیرا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ بھگوان جو کرے گا وہ ہر حالت میں ہمارے لئے بہتر ہوگا!"

داموں ہانپنے لگا۔ اُس کی نگاہیں نواب کی طرف اُٹھ رہی تھیں نواب مُنہ میں اُنگلی دبائے داموں کے جواب پر تعجب کر رہا تھا۔ داموں کو قریب بلا کر کہا۔

"بیٹے! تم بہت دُکھی معلوم ہوتے ہو۔ صاف صاف بیان کرو تم پر کیا ظلم ہوا ہے؟"

"مجھ پر کیا ظلم ہوا ہے؟ یہ میری ماں سے پوچھئے" داموں نے ماں کو آگے دھکیلتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہے مائی؟" نواب کی آواز پھر گونجی۔

بڑھیا نے لاٹھی کو سہارا دے کر دونوں ہاتھوں سے نواب کو پرنام کیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اے راجن! سُنتے آئے ہیں بادشاہوں کو رعایا اولاد سے بھی پیاری ہوتی ہے۔ میں بھی تمہاری لاوارث رعایا ہوں۔ تیرے بھائی نورنگ خاں نے میرا مکان چھین لیا۔ مجھے اور میرے یتیم بچّے کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ میری پونجی، میرے یتیم رامو کا اثاثہ گھر میں ڈال لیا۔ وہ جھونپڑا، جس میں ہم ماں بیٹا بیٹھ کر سستایا کرتے تھے۔ اب زمین کے برابر ہو چکا ہے۔ اے بادشاہ! تیرے راج میں ہم بیکسوں کے لئے نہ گرمی سے بچنے کا کوئی چھپّر باقی رہا ہے اور نہ سردی سے بچنے کا کوئی جھونپڑا!"

بڑھیا وفورِ غم سے رونے لگی۔

نواب نے شرم سے سر جھکا لیا اور کہا۔

"مائی! افسوس ہے، میرے بھائی نے تجھے تکلیف پہنچائی۔ مجھے معاف کر دو۔ اور دیکھو پھر میرے بھائی کو رُسوا بھی نہ کرنا میں ایسا فیصلہ کروں گا کہ دُنیا عبرت پکڑے گی۔ مگر جانتی ہو۔ نورنگ اور شجاع کی عزّت ایک ہے۔ میں اس کے خلاف تیری زبان سے ایک لفظ بھی نہ سُنوں،

یہ کہہ کر وزیر اعظم کو قریب بلایا اور فرمایا۔ "کیا پرچہ نویس کی رپورٹ اس بارے میں نہیں آئی؟"

"آچکی ہے عالم پناہ!" وزیر اعظم نے چند لمحات کے اندر مطلوبہ رپورٹ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔ پرچہ نویس کا ایک ایک لفظ بڑھیا کی تائید کرتا تھا۔ نواب نے سر اُٹھا کر بڑھیا سے خطاب کیا۔

"بہن! تم درست کہتی ہو۔ مگر خانِ اعظم نے دو سو بیگھے زمین بھی تو دینا کی ہے نا!"

"جی ہاں سرکار! مگر راموں راضی نہ ہوا نادان جو ہوا۔"

نواب نے مسکرا کر راموں سے پوچھا۔ "کیوں بچے! تیرا جھونپڑا دو سو بیگھے سے بھی زیادہ قیمتی تھا؟"

"مگر کوئی باپ دادا کی چیز بھی بیچتا ہے؟ میں کوئی دیوالیہ تھا کہ باپ کا مکان بیچتا!"

"راموں ٹھیک کہتا ہے" نواب نے پھیکی ہنستی ہنستے ہوئے کہا۔ "اے بڑھیا! گرا ہوا مکان تو دوبارہ نہیں مل سکتا۔ اگر کہو تو شجاع آباد میں اس سے بدرجہا بہتر اور مکان بنوا دوں!"

"اور مکان اچھا لگتا تو بھائی کے پاس ٹھٹھہ میں جا کر نہ بنوا لیتی!"

"تو پھر میرا شیش محل ہی لے لو۔ اس پر میرا اڑھائی لاکھ خرچ آیا ہے

میں اسی وقت دینے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ تم دعویٰ سے دستبردار ہو جاؤ!"
بڑھیا دیوانوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسی۔ کہا:۔
"مہاراج! ہر چیز کو اپنا آشیانہ پیارا ہوتا ہے۔ اگر شیش محل اڑھائی لاکھ کا ہے تو تیرے لئے، میرے کس کام کا۔ میں تو وہی تنگ و تاریک جھونپڑا مانگتی ہوں۔ اگر واپس لا دو تو میرا راضی نامہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ جس ظالم نے میرا مکان گرایا ہے تم اس کا مکان گرا دو!"
"کیا اس سے تمہارے انتقام کی پیاس بجھ جائے گی؟"
"ہاں! اگر بدلے کا بدلہ مل جائے گا۔ تو پھر کاہے کو نہ بجھے گی!"
نواب سنبھل کر تخت پر سیدھا ہو بیٹھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے دل میں کوئی قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ کہا:۔
"اے خاتون! ہم نے تیری فریاد کو سُنا۔ اگلے جمعہ کو سید فتح اللہ شاہ صاحبؒ کا عُرس ہے۔ وہاں ہمارا دربار بھی لگے گا۔ تمہارے مقدمہ کا فیصلہ وہیں کیا جائے گا!"

میلہ پیر فتح اللہ شاہؒ

پیر فتح اللہ شاہ صاحب اپنے عہد کے باکمال درویش تھے۔ ایک مسقف چبوترے پر دو پُراسرار صندوق رکھے تھے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ ان میں سے کسی ایک میں آپ کی نعش بند ہے۔ پیر صاحب کی یاد

ہر سال منائی جاتی تھی۔ لودھراں، گوگڑاں، ٹھٹھہ، بہاول پور، جلال پور اور شجاع آباد تک سے ہزاروں ہندو مسلمان بلا تفریق مذہب وملت اس اجتماع میں آکر شریک ہوتے تھے۔ خود نواب صاحب بھی بنفسِ نفیس تشریف لا کر یہاں دربار لگاتے تھے۔ رعایا کو عام اجازت تھی کہ جو چاہے اپنے بادشاہ سے ملے۔ اور جو درخواست گزارنا چاہے، بلاوسیلہ خود پیش کرے چنانچہ آج بھی وہی تقریب تھی۔ گردونواح سے بڑے بڑے طومان دار اور وڈیرے سا جمع ہو رہے تھے۔ مسجد کے سامنے لمبے چوڑے میدان میں وسیع شامیانہ نصب تھا۔ دن ڈھلے نواب صاحب نے خود نماز پڑھائی اور پھر دربار منعقد ہوا۔

ڈھنڈورچی نے پکار پکار کر اعلان کیا کہ جس کسی طومان دار یا کسی جاگیردار کے خلاف کچھ شکایت ہو، حضور میں عرض کرے۔ غول کے غول جن میں کئی فریادی تھے اور کئی تماشائی، شامیانے کی طرف متوجہ ہوئے۔

نواب صاحب نے پہلے پیر فتح اللہ شاہ صاحب کی پاکیزہ زندگی پر مجمل سی تقریر کی۔ اور لوگوں کو بتایا کہ جو دُنیا میں خلقِ خدا کے لئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی اس طرح خانقاہیں بنتی ہیں۔ لوگ ان کی یادگاریں مناتے ہیں۔ ہمیں اور تمہیں سب کو پیر صاحب کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ پھر کہا کہ خدا کو حاضر ناظر جان کر اپنی شکایات پیش کرو۔ اگر

کسی نے ہمارے حضور میں جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔ پہلے تو یقین ہے کہ اس کے جھوٹ کا بھانڈا یہیں پھوٹ جائے گا۔ اور اگر مکر و فریب سے وہ ہمیں دھوکہ دینے میں کامیاب ہو بھی گیا تو آخرت کی روسیاہی سے کیسے بچ سکتا ہے!

اب فریادی پیش ہونے شروع ہوئے۔ مجرموں کو خواہ وہ کتنے بڑے رُتبہ کے کیوں نہ تھے۔ بر سرِ دربار سزا دی گئی۔ بعض کو جرمانہ ہُوا۔ بعض کو تازیانے لگے اور بعض کو فوراً گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اب راموں پیش ہُوا۔ نواب نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور گرج کر کہا:۔

"خانِ اعظم نورنگ خاں کہاں ہیں؟"

ایک آدمی نے بڑھ کر کہا۔ "حضور! وہ سخت بیمار ہیں۔ ان کی حالت اِس قدر تشویشناک ہے کہ اُن کے صاحبزادے بھی اس دربار میں شریک نہیں ہو سکے!"

نواب نے اپنے جواں سال فرزند مظفر خان کو طلب کیا۔ تیس سال کا جوانِ رعنا پیش ہُوا۔

"ذرا قریب آنا مظفر!"

مظفر خان بالکل قریب ہو گیا۔ نواب نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا:۔ "دیکھو! میں کوٹ نورنگ جا کر تمہارے چچا کو معہ اہل و عیال و

مال و اسباب شجاع آباد روانہ کرتا ہوں۔ تم گھر پہنچ کر قندھاری محل کو فارغ کرو۔ اور اُسے سامان سے خوب آراستہ کرو، جب مہمان پہنچیں انہیں اس محل میں اتارو۔ دُوسرا محل جو اس کے متصل واقع ہے۔ اس میں ان کا سامان قرینہ سے رکھواؤ، مگر یہ کام اس رازداری سے انجام پائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکے ——— ہاں! ہوا ہو جاؤ!!"

منظفر خاں نے ادب سے سر جھکا کر باپ کو سلام کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگائی یہ جا وہ جا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اب نواب نے سواری طلب کی۔ فوراً شب دیز پیش کیا گیا۔ نواب صاحب سوار ہو کر شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ کوٹ نورنگ کو روانہ ہوئے۔

نواب کی غیر متوقع آمد

نورنگ خاں کو نواب کی طبیعت کا پورا اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر بڑھیا نے میرے خلاف استغاثہ دائر کیا تو مجھے بھی عوام کی طرح برسرِ اجلاس سزا ملے گی۔ اِس لئے وہ جھوٹ موٹ بیمار پڑ گیا تھا، مگر شرم و ندامت اور خوفِ پُرسش نے اُسے سچ مچ بیمار کر دیا۔ اَب

واقعی اُسے خونی اسہال آنے لگے تھے۔ لڑکوں میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ تن تنہا نواب چچا کے حضور میں پیش ہوتے۔ اس لئے ڈر کے مارے کوئی بھی میلے پر نہ گیا۔

عصر کے قریب غل اُٹھا کہ نواب صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ اس وحشت ناک خبر نے اور بُرا اثر کیا۔ نورنگ خاں سخت نڈھال ہو گیا، مگر اس کمزوری کے باوجود پل پل کی خبریں منگوا رہا تھا۔ دوسری اطلاع پہنچی کہ سرکار کی سواری شہر کے قریب بھی آ پہنچی۔ خانِ اعظم نے چلّا کر کہا:-

" ایّوب، خاں! بھائیوں کو لے کر استقبال کو پہنچو۔ کھڑے کیا دیکھتے ہو —— جاؤ بھی!"

سارے بھائی گھوڑوں پر سوار ہو کر پیشوائی کو روانہ ہوئے۔ ملازمین نے دیوانِ عام، دیوانِ خاص اور دیگر محلات کو آراستہ کرنا شروع کیا۔ گلی کوچوں میں سقے" چھڑکاؤ کرنے لگے۔ میر مطبخ نے کئی بکرے اور مرغے ذبح کر ڈالے۔ ہر شخص مستعدی سے اپنا اپنا ذمہ کام انجام دینے لگا۔ اور وہ کوٹ نورنگ جو چند ساعت پہلے سنسان پڑا تھا۔ ایسا اس میں چہل پہل اور گہما گہمی سے کان پڑی آواز بھی سُنائی نہ دیتی تھی۔

نواب صاحب نے بھتیجوں کو دُور سے دیکھتے ہی خندہ پیشانی سے سلام کیا۔ ایوب خاں فوراً گھوڑے سے اتر پڑا۔ باقیوں نے بھی اُتر کر گھوڑے ملازموں کے حوالے کئے اور سب پیدل روانہ ہوئے۔ نواب نے ہر ایک کے کندھے پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ اب یہ شاہانہ جلوس مسجد جامع کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نواب نے گھوڑے سے اُتر کر سب کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی اور پھر محل سرائے کو روانہ ہوئے۔

خانِ اعظم نورنگ خاں بیماری کے باوجود لاٹھی کے سہارے چل کر دروازے تک پیشوائی کو حاضر ہوا۔ دونوں بھائی بغل گیر ہو کر ملے۔ نواب صاحب دونوں ہاتھوں سے نورنگ خاں کو تھام کر بستر تک لے آئے اور دیر تک اِس اچانک بیماری کا افسوس کرتے رہے نواب صاحب کی دو بیٹیاں یہاں بیاہی ہوئی تھیں اور بڑی دیر سے شفیق باپ اور مہربان بھائیوں کی راہ تک رہی تھیں۔ حاضر ہو کر قدمبوس ہوئیں۔ نورنگ خاں کی باقی بہو بیٹیوں نے بھی شرفِ نیاز حاصل کیا۔ نواب نے خزانچی سے زیورات کا صندوق منگوا کر محل کی چھوٹی بڑی سب صاحبزادیوں کو طلائی ہار مرحمت فرمائے اور کہا:-

"خان بی بی تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ عرصہ سے تم ان کو ملنے نہیں گئیں اَب میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ تیاری کر لو۔ صبح سویرے ہم یہاں سے روانہ

ہو جائیں گے" رات کو بھائی سے کہا "آپ کی یہ حالت ہو گئی، اور مجھے اطلاع تک نہ دی۔ ادھر میں ایک ضعیف آدمی اور اتنی بڑی سلطنت کا بوجھ۔ بہتر یہ ہے کہ زندگی کے باقی ایّام ہل کر گزاریں۔۔۔ رعایا کے درمیان جو حجاب ہوتا ہے، اس کے باعث نہ وہ مجھے غلطی پر متنبہ کر سکتے ہیں اور نہ ملکی معاملات میں کوئی صائب رائے پیش کر سکتے ہیں میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ بھائی اور بھتیجوں کو ہی لے آؤں تاکہ حکومت کے معاملات میں وہ میرا ہاتھ بٹائیں اور میں کما حقّہٗ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکوں!"

نورنگ خاں جہاندیدہ اور دانا انسان تھا سب کچھ سمجھ گیا۔۔۔ مگر وضعداری قائم رکھتے ہوئے بولا۔

"سرکار کی عین کرم فرمائی ہے کہ غلام کو دشتِ غربت سے نکال کر پھر اپنے کلیجہ میں جگہ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کا میں کہاں تک شکریہ ادا کروں۔۔۔۔!"

زبان یہ الفاظ ادا کر رہی تھی، مگر دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔ آخر رہا نہ گیا اور آنکھوں سے پیارے شہر کی یادیں گرم گرم قطرات ٹپک پڑے۔

تباہی و بربادی

نواب صاحب "پیر فتح اللہ" سے ہی یہ تہیہ کر کے آئے تھے، کہ

نورنگ خاں کو مع اہل و عیال شجاع آباد دے جانا ہے۔ اس لیے سواری کے اونٹ گھوڑے ہمراہ لے کر آئے تھے اور یہاں بھی اصطبل میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ علی الصباح مستورات کو محملوں میں سوار کر کے ایوب خاں اور نصرت خاں کی ہمراہی میں شجاع آباد روانہ کیا۔ پھر نورنگ خاں کو اپنے تختِ رواں میں لٹا کر ان کے پیچھے پیچھے رخصت کیا۔ غضنفر خان بار برداری پر مامور تھا۔ خانِ اعظم کا کُل سامان حتیٰ کہ ان کے مطبخ کی لکڑیاں بھی اونٹوں پر لدوالی گئیں۔ جب سُورج نے طلوع کیا تو "کورٹ نورنگ" تصویرِ حیرت بنا خاموشی سے ایک ایک کا مُنہ تک رہا تھا۔

نواب کا غصہ ابھی فرو نہ ہُوا تھا۔ اس نے بُڑھیا کو طلب کیا اور کہا:۔
"اے نیک بخت! نورنگ خاں نے تجھ سے ایک جھونپڑا چھینا تھا میں نے اُس سے یہ سارا شہر چھین لیا۔ اُس نے تیرا ایک مکان گرایا تھا مگر دیکھ میں اس کے فلک بوس محلات سے کیا سلوک کرتا ہوں"۔

اُسی وقت حکم دیا کہ سوائے دیوانِ عام اور مسجد جامع کے نورنگ خاں کے تمام محلات کو گرا دیا جائے۔ راج مزدور جو سالہا سال سے ان فردوس نما عمارات کو بناتے آئے تھے۔ اب ان ہی ہاتھوں سے اس جنّتِ ارضی کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ بالآخر

سارا قلعہ مسمار ہو گیا۔ صرف دیوانِ عام درمیان میں دم بخود کھڑا دیدۂ عبرت سے آنسو بہا رہا تھا۔ نواب نے کہا۔

"اے بڑھیا! افسوس کہ ہم تیرا مکان نہیں دلا سکے۔ مگر کوٹ نورنگ کا سارا رقبہ تیرے حوالے کرتے ہیں۔ یہ کچہری کی عمارت ہے۔ اسے اپنے تصرّف میں لا۔ اور باقی ملبہ سے جس طرح چاہے اپنے اور اپنے ہمسایوں کے لئے مکان بنوا، مگر نورنگ خاں کو معاف کر دے۔"

یہ کہہ کر نواب نے گھوڑے کی باگ اُٹھائی اور رفقا سمیت شجاع آباد کا رُخ کیا۔

شام کو جب سورج اپنی زرد زرد کرنیں کورٹ نورنگ کے کھنڈرات پر نچھاور کر کے رخصت ہونے لگا تو اس نے دیکھا کہ رامو اور اس کی بڑھیا ماں کچہری کے سامنے مٹی کے ڈھیر پر بیٹھے رو رہے ہیں اور امن پاس کھڑا مسکرا رہا ہے۔

بابا ہری داس

"مہاراج! یہ ستار بردار میرا ملازم نہیں بلکہ میرا آقا اور مملکتِ ہند کا اَن داتا اکبرؔ شاہ ہے، جس نے محض مہاراج کے درشنوں کی خاطر یہ رُوپ دھارن کیا ہے!"

(تان سین)

"تان سین !"

"مہابلی !"

"آج ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کوئی ایسا نغمہ سناؤ جس سے ہماری ساری کلفتیں دُور ہو جائیں !"

"بہتر عالم پناہ !"

اکبری عہد کے "بلبلِ ہزار داستان" میاں تان سین نے یہ کہہ کر ستار اُٹھا، اس پر "شام کلیان" گانا شروع کیا۔

مغلِ اعظم کو یہ نغمہ بہت پسند تھا۔ جونہی اس کی خوش آئند آواز سماعت علیا میں پہنچی، اپنے مخمل کے بستر پر دراز ہو گیا اور بڑے ذوق شوق سے سننے لگا۔ دُنیائے موسیقی کا شہر یار تان سین بڑے جوش و خروش سے گاتا بجاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے رُوح پرور تأثرات نے تھوڑی دیر کے لئے دونوں کو دُنیا و مافیہا

سے بے نیاز کر دیا۔ تان سین کی اُنگلیاں بڑی تیزی سے ستار پر اپنا کام کر رہی تھیں۔ لحن داؤدی برابر سحر انگیزی میں مصروف تھا اور مغلِ اعظم الگ متکیف و بے خود نظر آتا تھا۔

راگ ختم ہو گیا۔ اکبر نے نیم وا آنکھوں سے تان سین کو دیکھا اور کہا:۔

" نغمہ بھی ایک جادُو ہے۔ میاں تان سین! آج ہم بہت خوش ہوئے "

تان سین ادائے شکر کے لئے زمین بوس ہوا۔ مغلِ اعظم نے سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا:۔

" میرے بلبل! جب ہمارا قلب و دماغ سلطنت کے تفکرات سے پریشان ہو جاتا ہے۔ جب ہم دربار سے تھک ہار کر یہاں آپڑتے ہیں تو تمہاری نغمہ سنجیاں ہمیں معاملاتِ شاہی کی تکمیل کے لئے دوبارہ تازہ دم کر دیتی ہیں۔"

" یہ حضور کی ذرّہ نوازی ہے کہ غلام کے حق میں اس قدر شفقت فرماتے ہیں، ورنہ ہندوستان کے شہنشاہ کو نائکوں اور مطربوں کی کیا کمی ہے "

" ہاں، ٹھیک کہتے ہو، مطرب ہزاروں مل سکتے ہیں مگر اس فنِ لطیف کا جگت گرُو تان سین اور نہیں مل سکتا۔"

" لیکن بابا ہری داس وہ کامل الفن مطرب ہے کہ تان سین بھی

اس کی شاگردی پر ناز کرتا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تان سین! کیا بابا ہری داس تم سے اچھا گا بجا سکتا ہے؟"

"ہاں مہابلی! وہ دُنیائے موسیقی کے بادشاہ ہیں — ان کی سحر انگیز لَے فرشتوں کو بھی مسحور کر دیتی ہے۔"

"یہ بات ہے ——؟"

"ہاں عالم پناہ!"

"ہم اسے دربار میں طلب کر کے اس کا گانا سُنیں گے۔ اگر واقعی وہ کامل الفن نکلا تو ہم اسے انعام و اکرام سے مالا مال کر دیں گے"۔

"مگر جہاں پناہ! سوامی جی ایک سادُھو ہیں۔ فقیر لوگ دربار میں آنا پسند نہیں کرتے۔ اِس لیئے طلب کر کے اُنہیں روحانی اذیّت نہ پہنچائیے!"

"اگر وہ نہ آئے گا تو اکبر خود جا کر اُس کا گانا سُنے گا!"

"اگر آپ تشریف لے گئے تو بھی وہ ہرگز نہ گائیں گے"۔

اِس جواب نے شہنشاہ کے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ بے ساختہ پکار اُٹھا۔

"تان سین! میں کسی نہ کسی صُورت اس باکمال انسان سے ضرور ملوں گا"

تان سین نے کچھ دیر فکر مند رہنے کے بعد عرض کیا :-

" اگر جہاں پناہ کو سوامی جی سے ملنے کا اس قدر اشتیاق ہے تو خفیہ طور سے اپنے خادم کے ہمراہ تشریف لے چلیں "۔

" ہاں ! ہم ایسا ہی کریں گے !"

(۲)

بالک ہٹ، تریا ہٹ اور راج ہٹ مشہور ہے۔ جب بھی بچّوں، عورتوں اور بادشاہوں کو کوئی خیال آجاتا ہے۔ فوراً اگر گزرتے ہیں، خاص کر اولوالعزم سلاطین کو ایک دفعہ جو خیال آجائے پھر جب تک اسے عملی جامہ نہ پہنالیں چین سے دم نہیں لیتے۔ چنانچہ ایک دن یہ باتیں ہوئیں، دُوسرے دن سلطنت کے کاروبار ابوالفضل کو سمجھا بجھا کر شہنشاہ اکبر ملازم کے بھیس میں تان سین کے ہمراہ متھرا کو چل دیا۔

متھرا پہنچ کر تان سین اپنے نقلی ملازم کے ہمراہ ایک سرائے میں اُترا۔ جُوں توں کر کے بڑی مشکل سے رات بسر کی، صبح سویرے اکبر اعظم سے اپنی ستار اُٹھوا کر جمنا کو روانہ ہوا۔ یہاں ایک گپھا میں باوا جی گیان دھیان میں مصروف تھے، کچھ دیر اُنہیں انتظار کرنا پڑا۔ جونہی فارغ ہوئے اور تان سین پر نگاہ پڑی۔ خوشی سے باغ باغ ہو گئے۔ بے تحاشا اُٹھے اور اپنے پُرانے چیلے کو کلیجے سے چمٹا

لیا۔ پھر پیار سے اپنے پاس بٹھا کر کہا۔

"کہو بیٹا! کیسی گزر رہی ہے؟"

"آپ کی دیا سے بہت اچھی گزر رہی ہے۔"

"ہاں بیٹا! تمہاری شہرت کی داستانیں سُن سُن کر میں اسی گوشے میں بیٹھا نہال ہو رہا ہوں۔ میں نے سُنا ہے کہ اکبر شاہ تم سے پریم کرتا ہے اور دربار کے سورما تم پر جان دیتے ہیں!"

"ہاں مہاراج! شہنشاہ کی قدردانی کا کیا کہنا، وہ بڑے دیالو ہیں، سوامی جی!"

"بیٹا! بادشاہوں کے دربار میں رہنا بڑا کٹھن کام ہے، دیکھنا کہیں تمہاری زبان سے پرماتما کے بے قصور بندوں کو نقصان نہ پہنچے جتنا ممکن ہو، ہر ایک سے بھلائی کرنا۔ کیونکہ بھلائی کرنا ہی سچا دھرم ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا مہاراج!"

"بیٹا! ذرا اُس وقت کو یاد کرو، جب تم گوالیار کے باغ میں شیر، بھالو اور بندر وغیرہ کی بولیاں بول کر پرندوں اور آدمیوں کو ڈرایا کرتے تھے۔ اُس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ایک زمانہ میں تم اکبر کے دربار میں جا کر چمکو گے! —— اَب جو بھگوان نے تم پہ اتنی دیا کی ہے تمہارا بھی فرض ہے کہ اس کی مخلوق پر

دیا کرو!"

سوامی جی اتنا کہنے پائے تھے کہ اچانک اکبرؔ پر نظر جا پڑی۔ پوچھا

"یہ کون ہے بیٹا!"

"میرا ساتھی ہے مہاراج! ستار لے کر ہمراہ آیا ہے!"

"اس کا چہرہ روشن اور اس کی آنکھیں بڑی چمکیلی ہیں۔ اسے نہ چھوڑنا! ــــــ تان سین! اس کی پیشانی سے خوش بختی کے آثار ظاہر ہیں!"

اکبرؔ نے سہم کر آنکھیں جھکالیں۔ کہ کہیں پردہ فاش نہ ہو جائے۔ تان سین نے بھی "ملازم" کے حق میں چند تعریفی جملے کہہ ڈالے پھر فوراً کہا:۔

"مہاراج! عرصہ سے تان سینؔ کے کان گروجی کی رسیلی اور دلکش آواز کے لیے ترس رہے ہیں، آج تو میں خاص چیز سننے کے لیے چرنوں میں حاضر ہوا ہوں!"

"ہاں، مگر ان دنوں طبیعت کچھ بدمزہ سی رہتی ہے اس لیے ہم گا تو نہیں سکیں گے"۔

تان سین نے گھبرا کر کہا:۔

"زیادہ نہ سہی، تھوڑا سا ہی سُنا دیجئے!"

" آگرہ کے دربار میں جا کر اپنے اُستاد کے مزاج کو بھی بھول گئے بیٹا!"

یہ صاف جواب سُن کر تان سین کے تو ہوش اُڑ گئے کہ جس مطلب کے لیے بادشاہ اتنی مشقّت کر کے آیا ہے۔ اگر حاصل نہ ہُوا تو بہت ہی بُرا ہو گا۔ مگر یہاں بھی اس کی طبیعت کی تیزی اپنا کام کر گئی۔ فوراً ستار اُٹھا ایک نغمہ چھیڑ دیا اور جان بوجھ کر غلطیاں کرنے لگا۔

باداجی نے اپنے باکمال شاگرد کو جو یوں غلط سلط الاپتے دیکھا سخت برہم ہوئے۔ ٹوکا اور کہا:۔

" تان سین! یہ کیا کر رہے ہو؟"

تان سین نے پھر نئے سرے سے راگ شروع کیا۔

سوامی جی نے ٹوکا، اور ساتھ ہی غصّے سے لال پیلے ہو گئے کہا:۔

" افسوس! تُو نے میری ساری محنت برباد کر دی۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ میرے مرنے پر تان سین میری جگہ پُر کر دے گا. لیکن میرا خیال غلط نکلا۔"

یہ کہہ کر ہاتھ بڑھا تان سین سے ستار چھین لی۔ اور پھر خود اس پر صحیح طریقے سے نغمہ سرائی کرنے لگے۔ اور ایسا سماں باندھا کہ ہر چیز

پر سکوت کا عالم چھا گیا۔ پرندے اُڑنے سے رُک گئے۔ جمنا کی سیمابی لہروں نے اُچھلنا اور تھرتھرانا بند کر دیا۔ شہنشاہ اکبر پر وجد کی حالت طاری ہو گئی۔ اس کی کنپٹیوں میں تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ رگوں میں سرسراہٹ سی رینگنے لگیں اور تان سین پہ الگ روحانی کیف اور جسمانی خمار چھا رہا تھا۔

نغمہ ختم ہو گیا۔ مہاراج نے ستار تان سین کے حوالے کی اور کہا

"صاحبِ کمال اِس طرح گایا کرتے ہیں۔"

اب تان سین کا مطلب حل ہو چکا تھا۔ اُس نے سوامی جی کے چرنوں کو چھُو کر کہا۔

"مہاراج! یہ ستار بردار میرا ملازم نہیں، بلکہ میرا آقا اور مملکتِ ہند کا اَن داتا اکبر شاہ ہے، جس نے محض مہاراج کے درشنوں کی خاطر یہ رُوپ دھارن کیا ہے۔"

یہ سُنتے ہی سوامی جی پر سب حال منکشف ہو گیا۔ فوراً کھڑے ہو گئے اور اکبرِ اعظم سے بغل گیر ہوتے ہوئے کہا۔

زِ قدرِ شوکتِ سلطاں نہ گشت چیزے کم
زِ التفات بہ مہماں سرائے دہقانے
کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

کہ سایہ بر سرش افگند چوں تو سلطانے

اب نقلی ملازم اپنی اصلی شان میں نمودار ہو کر مسند پر براجمان ہوا۔ متھرا میں ایک غلغلہ برپا ہو گیا کہ سوامی جی سے ملنے کے لئے شہنشاہ اکبر بھیس بدل کر یہاں آیا ہے۔ گورنر نے اپنے خدم وحشم کے ساتھ حاضر ہو کر سلامی دی۔ توپیں سر ہوئیں اور گھاٹ کے سادھوؤں کو انعام واکرام سے مالا مال کر دیا گیا۔

بادشاہ نے سوامی جی کو دربار کے نورتنوں میں داخل کرنا چاہا مگر اس آزاد منش سادھو نے اپنے بڑھاپے اور گوشہ نشینی کا عذر پیش کر کے انکار کر دیا، اور کہا:-

"مہاراج! مجھے شانتی سے بھگوان کی پوجا کرنے دیجئے!"

اس پر مغلِ اعظم نے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا جمنا کے گھاٹ پر سوامی جی کی اس ملاقات کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایک حسین وجمیل مرمریں گپھا بنوا دی۔ اس کے بعد جب کبھی بادشاہ کو سوامی جی کے گانا سننے کی خواہش ہوتی، خود متھرا میں حاضر ہو کر اس کے کمالِ فن کی داد دیا کرتے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو فنِ لطیف کا جگت گرو کبھی اکبر کے دربار میں حاضر ہوا، اور نہ بادشاہ نے کبھی آنے کی تکلیف دی۔

آہ! وہ کتنا بابرکت زمانہ تھا، جبکہ ایسے ایسے جلیل القدر شہنشاہ اپنی رعایا کے باکمال آدمیوں کو ملنے اور انہیں انعام سے نوازنے کے لیئے بھیس بدل کر سفر کیا کرتے تھے۔ آہ، پریم اور شانت کا وہ کتنا سُندر جگ تھا۔ جب کہ ہندوستانی قومی اور نسلی امتیاز کے بغیر آپس میں شیر و شکر ہو کر گزارا کرتے تھے لیکن افسوس آج زمانہ کتنا بدل گیا ہے کہ بھائی بھائی کا دُشمن ہو رہا ہے، اور بڑے بڑے صاحبِ کمال اپنے جگر پاروں کو ہتھیلی پر لیئے پھرتے ہیں مگر کوئی دو پیسے کو بھی نہیں خریدتا ہے

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر مے بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر مے بینم
اسپِ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر مے بینم

تمباکو

"چونکہ تمباکو کا بہت سے آدمیوں کی صحت اور دماغ پر بُرا اثر پڑا ہے۔ اس لئے ہم نے حکم دیا ہے کہ کوئی شخص حقّہ نوشی کی عادت نہ ڈالے!"

(جہانگیر اعظم)

اسد بیگ کو بیجا پور میں آئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ اکبر اعظم نے اُسے شاہ بیجا پور کی خدمت میں اس لئے بھیجا تھا کہ وہ اس سے شہنشاہ کے کسی فرزند کے لئے لڑکی کا رشتہ طلب کرے۔ اس نے بازار میں چند آدمیوں کو حُقّہ پیتے دیکھا۔ چونکہ اسد بیگ نے عمر بھر میں کہیں حُقّہ نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کی شکل وصورت سے بیحد متعجب ہُوا۔ اور اس خیال سے کہ اس تحفہ کو شہنشاہ کی خدمت میں لے جائے تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ بڑے شوق سے ایک ایسے انگریز سے جا ملا جو بیجا پور میں حقّے اور تمباکو کا پہلا سوداگر تھا۔ اس سے کچھ تمباکو خریدا۔ پھر ایک نہایت ہی دل پسند حُقّہ تیار کرایا۔ اس کا پیندا بہت خوبصورت تھا، اور اسے ہیرے جواہرات اور مینا کاری سے مرصّع کیا گیا۔ حُسنِ اتفاق سے اسد بیگ کو عقیقِ یمنی کی مہنال عمدہ اور بیضوی مل گئی۔ اُسے نیچے پر چڑھا لیا۔ چلم

خالص سونے کی تیار کی گئی اور نیچہ کو سُرخ مخمل سے منڈھوایا تاکہ حُقّہ ہر طرح سے حسین و جمیل نظر آئے۔

اسد بیگ اس مہم سے بامراد اور شاد کام واپس لوٹا اور اپنے ساتھ شہنشاہ کے لئے بہت سے تحفے بھی جمع کر لایا۔ جب انہیں سجا کر دربار میں پیش کیا تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور اسد بیگ سے فرمایا:۔ " تو نے اتنی چیزیں اس تھوڑے سے عرصہ میں کیسے جمع کر لیں؟"

اتنے میں بادشاہ کی نظر "حقے" پر پڑی۔ اس کی عجیب و غریب شکل دیکھ کر پھڑک اٹھا۔ قریب منگوا کر غور سے ملاحظہ فرمایا۔ تمباکو کا میگزین، نیچے کا واٹر ورکس، دلفریب اور دلکش نَلی، ہر چیز پر بار بار نظر ڈالی اور تمباکو کی طشتری کو غور سے دیکھتے ہوئے اسد بیگ سے کہا:

" میاں! یہ کیا چیز ہے، اور یہ سب کارخانہ کس لئے ہے؟"

نواب خانِ اعظم نے مسکرا کر نہایت ہی لطیف انداز میں جواب دیا:۔

"جہاں پناہ! یہ تمباکو ہے جو کہ مدینہ اور اس کے نواح میں ملتا ہے اور یہ صاحب دولت کے طور پر حضور کی خاطر لائے ہیں!"

شہنشاہ نے مسکرا کر اسد بیگ پر اپنی کیمیا اثر نظر ڈالی اور فرمایا:۔

"حقّہ بھر کر پیش کیا جائے۔"
چنانچہ بر سرِ دربار حقّہ کے میگزین میں تمباکو رکھا گیا۔ بتّی کو آگ دکھائی گئی۔ جس سے چلم روشن ہو گئی۔ حقّہ کو تخت کے قریب مناسب جگہ پہ رکھ دیا گیا۔ شہنشاہ نے ہاتھ بڑھا کر مہال کو پکڑا اور بائیں طرف اپنے خاص حکیم کی طرف توجہ فرمائی۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ "یہ غلام جہاں پناہ کو حقّہ پینے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔"
اکبرِ اعظم نے مسکرا کر اسد بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:۔
"مگر ہم اسد بیگ کی خاطر اسے ضرور پئیں گے۔"
یہ کہہ کر حقّے کی مہال اپنے منہ میں لے کر دو تین کش لگائے اس پر حکیم صاحب نے گھبرا کر عرض کی:۔
"ظلِّ اللہ! غلام پر رحم فرمائیں اور اس بلا کو منہ نہ لگائیں!"
بادشاہ نے مہال اپنے منہ سے نکالتے ہوئے خانِ اعظم سے کہا:
"آؤ، اس کی آزمائش کریں۔" — تھوڑا سا تمباکو عطارِ شاہی کے آگے رکھا گیا کہ دیکھ کر اس کے خواص بیان کرے۔
عطار بولا۔ ہماری کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ یہ کوئی نئی چیز معلوم ہوتی ہے۔ حقّے پر غور سے نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کا پیندا تو چین کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہ ایک نادر چیز ہے۔"

حکیم صاحب نے بڑھ کر عرض کی ؛۔

"جہاں پناہ! تمباکو ایک ناآزمودہ دوا ہے۔ اس کے بارے میں متقدمین نے کچھ نہیں لکھا۔ ایسی چیز جس کے حق میں ہماری کتابیں خاموش ہوں اور ہمارے بزرگوں نے کچھ رائے نہ دی ہو۔ اس کا استعمال کیسے کیا جاسکتا ہے، اور پھر اعلیٰ حضرت جیسے شہنشاہ کے لئے تو کسی صورت بھی مناسب نہیں کہ ایسی مشتبہ چیز کی آزمائش فرمائیں"۔

اسدبیگ غصّہ سے تلملا اُٹھا۔ وہ حقّے کو بڑی محنت سے لایا تھا۔ اور اس پر اس کی بڑی رقم خرچ ہوئی تھی۔ اس نے جھنجلا کر حکیم سے کہا ؛۔

"انگریز ایسے ناتجربہ کار نہیں ہیں کہ اُنہیں اس بارے میں مکمل واقفیت نہ ہو۔ اور انگریزوں میں ایسے عاقل اور دانا ہیں جو شاذونادر غلطی کرتے ہیں، تم آزمائش کئے بغیر اس کے خواص کیسے جان سکتے ہو؟ اور اس کے متعلق اپنی ایسی رائے کیسے دے سکتے ہو۔ جس پر تمام بڑے بڑے عالم فاضل بھروسہ کر سکیں۔ کسی چیز کی خوبی اور بُرائی تجربہ کے بغیر کیسے معلوم ہو سکتی ہے"۔

حکیم صاحب نے دربار کے آداب کا لحاظ کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "ہم انگریزوں کی نقل کرنا اور اس رسم کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔ جس کی ہمارے بزرگوں نے اجازت نہ دی ہو"۔

اسد بیگ نے تنک کر کہا کہ "واقعی تمباکو عجیب و غریب چیز ہے لیکن دُنیا میں ایسی کونسی شے ہے جو حضرت آدم سے آج تک کسی نہ کسی زمانہ میں عجیب و غریب نہ سمجھی گئی ہو اور وقتاً فوقتاً ایجاد نہ ہوئی ہو۔ جب کوئی چیز دُنیا میں مشہور ہو جاتی ہے تو ہر شخص بغیر کسی خوف اور خطرے کے اُسے استعمال کرنے لگتا ہے۔ عقلمند لوگوں کو کسی چیز کی خوبیوں اور عیبوں پر پوری طرح سے غور و فکر کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ کسی چیز کی خوبیاں یکبارگی ظاہر ہو جائیں۔ مثلاً دار چینی جو پہلے زمانہ میں معلوم نہ تھی۔ حال ہی میں دریافت ہوئی ہے اور بہت سے امراض میں کام آتی ہے۔"

جب شہنشاہ نے اسد بیگ کو دلیرانہ وار مناظرہ اور مباحثہ کرتے دیکھا تو وہ بے حد حیران ہوا اور خوش ہو کر اسے تحسین و آفرین کی، اور خانِ اعظم سے فرمایا۔ "تم نے سُنا! اسد بیگ نے کیا عقلمندانہ تقریر کی ہے یہ درست ہے کہ اگر ہم کسی ایسی چیز کو کتابوں میں نہ پائیں جسے دُوسری قوم کے عقلمند لوگ استعمال کرتے ہیں تو ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ ہم اس کا استعمال نہ کریں اور اسے تجربہ میں نہ لائیں!"

حکیم صاحب کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ بادشاہ نے روک دیا۔ چونکہ اسد بیگ اپنے ہمراہ کافی تمباکو لایا تھا۔ اس لئے اُس نے بہت سے امیروں وزیروں میں اسے تقسیم کیا۔ اگرچہ شہنشاہ نے پھر بھُول کر بھی حُقّہ کو مُنہ نہ

لگایا۔ لیکن خانِ اعظم کو ایسی لت پڑی کہ وہ عمر بھر اس کا پانی بھرتے رہے خواص سے اس کا رواج عوام تک پہنچا اور اس کی مانگ دیکھ کر انگریزوں نے بیچنا شروع کیا۔ ممالکِ متوسط اکبر آباد اور الہ آباد کے صوبوں میں اس کی کاشت شروع ہوئی۔ جہانگیر کے زمانے میں اسے ہر شخص پینے لگا اُس نے اس کے انسداد کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا چنانچہ لکھتا ہے :۔

"چونکہ تمباکو کا بہت سے آدمیوں کی صحت اور دماغ پر بُرا اثر پڑتا ہے، اس لئے ہم نے حکم دیا ہے کہ کوئی شخص حُقّہ نوشی کی عادت نہ ڈالے۔"

جہانگیر نے حُقّہ نوشی کو روکنے کے لئے سخت احکام صادر کئے، بلکہ اس جُرم میں لاہور شہر کے اندر بعض کے ہونٹ بھی کاٹے گئے اس پر بھی لوگ چھُپ چھُپ کر پیتے تھے۔ جب اس نیک دل اور رعایا پرور سلطان نے دیکھا کہ رعایا اس بلا کو نہیں چھوڑ سکتی تو وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا یہ شعر اب تک متداول چلا آتا ہے ؎

بسیار کسے خواہدش از دل و جاں
کمیاب کسے بود کہ او را کم خواست

زنجیرِ عدل

جہانگیرِ اعظم نے حقارت سے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا۔" اتنے کرتوتوں کے بعد بھی معافی کا امیدوار ہے؟ مجھے دُنیا میں بدنام کیا، میرے ملک میں آنے والے پردیسیوں کو اس طرح لوٹا جس طرح گِدھ اور کُتّے مردہ لاش کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نوچتے ہیں۔ اگر تجھے کُھلے بندوں چھوڑ دوں تو تیرے بھائی جو بنگال اور دکن جیسے دُور دَس مقامات میں بیٹھے ہیں وہ کیا کچھ نہ کرسکیں گے!"

آج عبد اللہ بھٹیارے کی سرائے میں معمول سے زیادہ بھیڑ تھی کیونکہ کابل سے ولایتی سوداگروں کا جو قافلہ آیا تھا وہ اسی کے پاس آکر ٹھہرا تھا۔ تمام کمرے لگ چکے تھے لیکن ابھی بے شمار پٹھان اپنے بقچے سنبھالے، صحن میں گٹھڑیاں بنے پڑے تھے۔ عبد اللہ نے مغرب کے وقت کانو رام کھتری سے چار سو چارپائیاں منگوائیں اور سب کی سب مسافروں میں بانٹ دیں۔ ابھی ان کو کھانا کھلانا باقی تھا کہ ایک اور خچر سوار اندر داخل ہوا۔

نووارد نے ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ اُس نے آتے ہی گرج دار آواز میں کہا:۔

"سرائے والا کہاں ہے؟"

عبد اللہ لپک کر پہنچا اور کہا۔

"خوش آمدی! اے سردار فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر

سکتا ہوں؟"

"ایک کمرہ، دو چار پائیاں۔ اِس جانور کا گھاس۔ سمجھے!"

نو وارد نے عورت کو ایک جانب سامان کے پاس بِٹھا دیا، اور خود پٹھانوں کے پاس جا بیٹھا۔

پٹھان کش مش اور چلغوزے سے دل بہلا رہے ہے۔ اور کئی کھانا پکانے کے لئے آٹا گوندھ رہے تھے۔ بھٹیارے کی بیوی سامنے سے گزری۔ سب کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔

"کتنی خوبصورت ہے؟" ایک پٹھان بولا

"اور کتنی طرح دار ہے!" دوسرے نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

تیسرے نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"کیوں نہ ہو، کوتوال صاحب اس پر مرتے ہیں اور شہر کے عیّاش اس پر جان دیتے ہیں!"

نو وارد کے کان میں کوتوال کی بھنک پڑی تو چونک کر بولا۔

"کیوں بھئی، شہر کا کوتوال کیسا آدمی ہے؟"

"اس سے پوچھو ___!" ایک پٹھان نے بھٹیارن کی طرف معنی خیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اس بھٹیارن سے ــــ!" اجنبی نے حیرت سے پُوچھا۔

"ہاں، ہاں، اسی سے! جو رات بھر اس کے سینہ پر کھیلتی اور پردیسیوں سے رشوت لے لے کر اس کی جیب گرم کرتی ہے۔"

بھٹیارہ بیوی کے ہمراہ ادھر کو آرہا تھا۔ پٹھان سرگوشی کرتے ہوئے چپ ہو گئے۔

بھٹیارن نے آکر اجنبی کو غور سے دیکھا اور غلط انداز سے اس کی بیوی اور سامان پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ کہاں سے آئے؟

کئے دن قیام رہے گا؟

آگرے میں کیا کام ہے؟

آپ کی یہاں کسی سے واقفیت بھی ہے؟

یہ آپ کی کیا لگتی ہے ــــ؟" وغیرہ

اُس نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"ہم مسافر ہے اور سوداگر ہے۔ یہاں رہے گا اور بیوپار کریگا تنگ مت کرو، چلو کمرہ کھولو!"

"میرے پیچھے آؤ۔" یہ کہہ کر بھٹیارن چابیاں ہاتھ میں لے، کولھے مٹکاتی ہوئی ہوٹل کی طرف روانہ ہوئی۔ کمرہ کھول کر اجنبی

کے حوالے کیا۔ بھٹیارے نے دو چارپائیاں ڈال دیں اور خچر کو باندھنے کے لئے اصطبل میں لے گیا۔

نوواردنے سامان اندر رکھ دیا۔ پھر بقچے سے ایک انگوٹھی نکال کر بھٹیارے کے پاس آیا۔" کہا ہم دُور سے آرہے ہیں۔ خرچ ختم ہو گیا ہے۔ اسے بازار میں فروخت کر کے قیمت لادو!"

بھٹیارن نے للچائی ہوئی نظروں سے انگوٹھی کو دیکھا۔ پھر اُسے ہاتھ میں لے کر دیکھتی، ٹٹولتی مکان کو چلی گئی۔

(۲)

ایک تہائی رات گزری تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مسافر نے ہڑبڑا کر کہا:۔ "کون ہے؟ کیا بات ہے؟؟"

"تمہیں کوتوال صاحب نے یاد کیا ہے!"

مسافر ایک لمبا سانس لے کر بولا ـــــ "اوہ ـــــ سمجھا!"

اور پھر جلدی جلدی صافہ باندھ کر باہر نکل آیا۔ سرائے کے صحن میں کرسی پر کوتوال صاحب بیٹھے ایک پٹھان سے گرم ہو رہے تھے۔ دس سپاہی ایک طرف قطار بنائے کھڑے تھے۔ کوتوال نے چراغ اُٹھا کر اس کی روشنی میں مسافر کو غور سے دیکھا۔ پُوچھا:۔

"تمہارا نام کیا ہے، اور کہاں سے آرہے ہو؟"

مسافر نے کہا۔ "میرا نام مسعود ہے۔ میں غزنی سے آرہا ہوں۔ سوداگر آدمی ہوں۔ یہاں بیوپار کروں گا۔"

"یہ انگوٹھی تمہیں کہاں سے ملی؟"

"یہ انگوٹھی مجھے ورثہ میں ملی ہے۔ اس کے علاوہ میری بیوی کے پاس اور بھی بہت سے زیورات ہیں۔"

یہ کہہ کر مسعود اندر گیا اور بیوی کے زیورات کا بکس اٹھا لایا۔

کوتوال نے چند زیورات کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ہیروں کی چمک دمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کہا "یہ زیورات چوری کے معلوم ہوتے ہیں۔ جب تک ان کے متعلق پوری تحقیقات نہ ہو جائے۔ تم کو حوالات میں رہنا پڑے گا!"

مسعود پر اس دھمکی کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے بے پروائی سے کہا:۔

"آنرا کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک۔ جتنی دفعہ جی چاہے تحقیقات کر لیجئے مگر ہم حوالات میں کیوں جائیں۔ اور کیا یہ سرائے حوالات سے کم ہے۔ اِس بھٹیارن سے ہم کو سنبھال لینا!"

بھٹیارن کے لفظ پر کوتوال مسکرایا۔ اور بھٹیارن پر معنی خیز نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ——— "کیوں؟ ——— اِس کا ذمہ لیتی ہو؟"

"ہاں، مجھے تو یہ شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور خاص کر زیورات بھی تو آپ کے پاس ہیں۔ رات کو سرائے کا پھاٹک بھی بند رہتا ہے یہ بھاگ کر کہاں جائے گا!"

"بہتر ——!" کوتوال نے تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ یہ دیکھ کر کہ کوتوال کا پارہ ٹھنڈا ہو گیا ہے مسعود نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر آگے پیش کیا اور کہا:۔

"اس کاغذ پر زیورات کی رسید لکھ دیجئے!"

"تم بہت ہی بے ادب ہو" —— کوتوال نے برہم ہو کر جواب دیا —— "کیا تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ میں اس شہر کا کوتوال ہوں۔ بادشاہ اور وزیر کے بعد اس شہر میں میرا سکہ چلتا ہے۔ اتنے بڑے حاکم پر خیانت کا گمان کرتے ہوئے تجھے شرم بھی نہیں آئی؟"

مسعود بولا —— "جناب والا کا عہدہ بندہ کو معلوم ہے۔ مگر قرآن شریف میں خداوند پاک نے حکم دیا ہے کہ اپنے معاملات لکھ لیا کرو!"

ان الفاظ نے کوتوال کی آتش غضب پر مہمیز کا کام کیا۔ گرج کر بولا:۔ "گستاخ آدمی! تو مجھے شریعت کے سبق دیتا ہے۔ ہم

خود قرآن و حدیث کے حافظ ہیں۔ اور دین کے معاملات کو تجھ سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں۔"

کوتوال کھڑا ہو گیا۔ زیورات کا ڈبہ بھٹیارن کے سپرد کیا اور انگوٹھی خود رکھ لی۔ ایک بار گرم نگاہوں سے مسعود پر نظر ڈالی اور اپنے سپاہیوں کے ہمراہ چل دیا۔

(۳)

دُوسرے دن دوپہر تک مسعود کوتوال کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آیا تنگ ہو کر بھٹیارن کے پاس آیا اور پوچھا:۔

"کوتوال کب آئے گا؟"

بھٹیارن مسافروں میں کھانا تقسیم کر رہی تھی۔ مسکرا کر بولی:۔

"بڑے میاں! صبر سے کام لو۔ تم جانتے ہو کوتوال صاحب سارے شہر کے مالک ہیں۔ اتنا کام ہوتا ہے کہ انہیں سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ہوتی۔ جب موقع ملے گا آجائیں گے!"

مسعود اپنے کمرے کے سامنے جا بیٹھا۔ بھٹیارن نے نہایت پُرتکلّف کھانا بھجوایا۔ اس نے کچھ اندر بھیجا۔ اور کچھ خود کھایا۔ سرائے کے جن پٹھانوں کو اِس واقعہ کا علم ہو چکا تھا۔ وہ مسعود سے ہمدردی کرتے رہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے

مال ہیں کوتوال کا حصّہ مقرر ہے۔ جونہی وہ یہاں آکر سامان اتارتے ہیں، بھٹیارن اس کا حصّہ وصول کر لیتی ہے۔

تین دن گزر گئے مگر کوتوال پھر سرائے میں نہ آیا۔ مسعود نے بھٹیارے سے کہا کہ اگر کوتوال کو فرصت نہیں تو تم مجھے وہاں چھوڑ آؤ، مگر اس نے بگڑ کر ہاتھ جھٹک دیا۔ آخر مسعود خود کوتوالی میں پہنچا۔ لیکن وہاں کوتوال نے بات تک نہ سنی اور سپاہیوں نے دھکے دے کر کوتوالی سے نکال دیا۔

مسعود نہایت مایوس ہو کر لوٹا۔ سرائے کے پٹھانوں نے کہا کہ اگر تم نے زیورات حاصل کرنے ہیں تو جمنا پر جا کر زنجیرِ عدل کھینچو، بادشاہ تمہارا انصاف کرے گا۔ اور کوتوال کو قرار واقعی سزا ملے گی۔

مسعود نے زنجیر عدل کا پورا پتہ دریافت کر کے بیوی سمیت جمنا کا رُخ کیا۔ قلعے کے پاس ثمن برج کے ساتھ کئی من کی سنہری زنجیر لٹک رہی تھی۔ جس کا دوسرا سرا ایک مینار کے ساتھ بندھا تھا، اور زنجیر کے ساتھ گھنٹے لگے ہوئے تھے۔

مسعود نے زنجیر کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ایک عجیب غلغلہ برپا ہوا جس کی آواز دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ محل کے گھنٹے ابھی تک بج رہے ہیں۔ دو تین دفعہ زنجیر ہلانے کے بعد مسعود محل کی طرف

مُنہ کر کے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

جھروکے سے پُر جلال آواز گونجی:۔

"کس نے پکارا ہم کو؟"

"حضُور والا! ہم اجنبی مسافر ہیں۔ عبداللہ بھٹیارے کی سرائے میں ٹھہرے تھے۔ کوتوال نے ہم سے زیورات کا ڈبہ چھین لیا ہم نے بہتیری منّت سماجت کی مگر اس نے نہیں مانا۔ دوہائی ہے جہاں پناہ کی!"

بادشاہ نے گہری نظر سے فریادی کے سراپا کو دیکھا معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ سلامت فریادی کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

شہنشاہ نے مسکرا کر کہا:۔

"فریادی! تسلّی رکھ، ہم انصاف کریں گے!"

خواجہ سرا سے حکم ہُوا کہ فریادی کو دربار میں لے چلو، وہیں اس کا مقدّمہ سماعت ہو گا۔

(۴)

مسعود اور اس کی بیوی خواجہ سرا کے ساتھ خندق کے گرد چکر کاٹتے ہوئے دہلی دروازے سے قلعے میں داخل ہوئے۔ چپّے چپّے پر پہرے دار تعینات تھے۔ روشن چوکی پر شہنائیاں بج رہی تھیں۔

خواجہ سرائے نے کہا:۔

"ہم ابھی چکر کاٹ رہے ہیں، لیکن جہاں پناہ دربار میں بھی پہنچ گئے۔"

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟" ــــــ مسعود نے تعجب سے سوال کیا۔

"نوبت جو بج رہی ہے!" خواجہ سرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دیوانِ عام قریب آچکا تھا۔ شہنشاہ نورالدّین جہانگیر اکبری تخت پر بیٹھے دادِ انصاف دے رہے تھے۔ مسعود کو دور سے آتا ہوا دیکھ کر امیر الامرار مرزا محمد شریف سے خطاب کیا اور فرمایا:۔

بادشاہ:۔ "تم نے کبھی کوتوالِ شہر کے متعلق بھی تحقیقات کی ہے کہ وہ کیسا آدمی ہے؟"

وزیرِ اعظم:۔ "بظاہر وہ اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کبھی اس کے خلاف شکایت بھی نہیں گزری۔ باطن کے متعلق کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ع محتسب را درونِ خانہ چہ کار؟"

بادشاہ:۔ "بعض افسر ایسے جابر ہوتے ہیں کہ اُن کے رُعب سے لوگوں کو شکایت کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔"

وزیرِ اعظم:۔ "بجا ارشاد ہوا جہاں پناہ!"

بادشاہ :۔ "ہم چاہتے ہیں کہ تم خود مسافروں کا بھیس بدل کر رعایا کا حال معلوم کرو۔ ہمیں خبر ملی ہے کہ وہ رشوت لیتا ہے۔"

جہانگیر نے مسکراتے ہوئے وزیرِ اعظم پر نظر ڈالی اور فرمایا :۔

"دیکھو مرزا محمد شریف! تم اور ہم بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہمیشہ دُکھ سُکھ میں ایک دُوسرے کے شریک رہے۔ ہم نے تمہیں نوازا اور امیر الامرائی سے سرفراز کیا۔ حکومت کے کاروبار میں اگر تم تن دہی سے میرا ہاتھ نہ بٹاؤ تو میں ایسی عظیم الشان خدمت سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں!"

وزیرِ اعظم :۔ "حضورِ والا پر فدوی کی جاں نثاری مخفی نہیں۔ عمر اسی دُھن میں بسر ہو گئی۔ اب حیاتِ مستعار کے چند ایام باقی ہیں اُمید ہے کہ خدائے ذوالجلال وہ بھی حضورؐ کی خیر سگالی میں بسر کرنے کی توفیق عطا کرے گا!"

مسعود تخت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بادشاہ نے بڑی نرمی سے کہا :۔

"اے پردیسی مسافر! بول کیا معاملہ ہے؟"

مسعود آدابِ شاہی بجا لانے کے لئے زمین تک جھک گیا اور انتہائی ادب سے یوں عرض گزار ہوا :۔

"جہاں پناہ! یہ غریب الدیار بال بچوں کے لئے کچھ کما لانے کو اس سنہری مملکت میں داخل ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ حضورِ والا کے کوتوال نے غلام کی ساری پونجی چھین لی۔"

امرائے دربار حیرت سے فریادی کو دیکھنے لگے۔ اُن کو اگرچہ کوتوال کی بے اعتدالیوں کا پورا علم تھا۔ مگر اُنہیں یہ خواب و گمان بھی نہ تھا کہ اس کی رشوت خوری کا بھانڈا اس طرح چوراہے پر پھوٹے گا۔ مسعود اپنی درد بھری کہانی اس طرح بیان کر رہا تھا۔

"خداوندِ عالم! یہ غلام جو کچھ غزنی سے لے کر چلا تھا، وہ اس طولانی سفر کی نذر ہوا۔ صرف بیوی کے چند زیور بچ رہے تھے۔ وہ کوتوالِ شہر نے چھین لئے۔ اُلٹا ہمیں چوری کے شبہ میں گرفتار کر کے قید کرنا چاہتا تھا کہ ہم نے منّت زاری کر کے جان بچائی!"

شہنشاہ نے معنی خیز نگاہوں سے وزیرِ اعظم کو دیکھا —— "یہ ہیں آپ کے کوتوال صاحب!"

پھر گرج کر کہا۔

"کوتوال حاضر ہو!"

کوتوال دربار میں موجود تھا۔ اور یہ تمام کارروائی بچشم خود دیکھ رہا تھا۔ شش و پنج کے عالم میں آگے بڑھ کر زمین بوس ہوا۔

شہنشاہ نے للکار کر کہا:۔

"کوتوال! یہ پردیسی تم پر زیورات چھیننے کا الزام لگاتا ہے اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟"

"خداوند! یہ جھوٹ بکتا ہے۔ میں نے آج سے پہلے کبھی اس کی صورت بھی نہیں دیکھی!"

"بہتر!" ——— شہنشاہ نے وزیر اعظم سے فرمایا ——— "عبداللہ بھٹیارا اور اس کی بیوی کو اسی وقت حاضرِ دربار کیا جائے!"

پیادے فوراً دوڑ کر گئے اور بھٹیارے کو اس کی بیوی سمیت کشاں کشاں لے آئے۔

شہنشاہ نے کوتوال کو تخت کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ تاکہ بھٹیارہ اور اس کی بھٹیاری اسے نہ دیکھ سکیں۔ شہنشاہ نے نہایت ملائمت سے بھٹیارے کو خطاب کیا۔

"جس وقت مسافر نے اپنے زیورات کوتوال کو دیئے تھے، کیا تیری بیوی وہاں موجود تھی؟"

"جی ہاں خداوند! میری بیوی اس وقت موجود تھی"! بھٹیارے نے عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے عرض کی۔ اب بادشاہ نے بھٹیاری کی طرف توجہ فرمائی:۔

"کیا تُو نے زیورات شمار کئے تھے؟"

"جی ہاں جہاں پناہ! کوتوال صاحب صرف ایک انگوٹھی ہمراہ لے گئے تھے۔ باقی زیورات میرے پاس امانت کے طور پر چھوڑ گئے تھے۔"

بادشاہ نے کوتوال کو سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپتا ہوا پیش ہوا۔ بادشاہ نے پُوچھا:-

"کیا ابھی تک تُو نے مسافر کو نہیں پہچانا؟"

کوتوال نے ڈرتے ڈرتے مسافر پر نظر کی۔ پردیسی نے سر سے ڈھاٹا ہٹایا اور مصنوعی داڑھی بھی اُتار پھینکی۔ کوتوال نے مُنہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی ——— "شیخ سالم!"

دربار بھی حیرت کے سمندر میں ڈُوب گیا۔ جہاں پناہ نے غضبناک ہو کر فرمایا:-

"شیطان! کیا تُو یہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ تیری کرتوتوں سے غافل ہے؟ ہمارے کانوں میں تیری ساری باتیں پہنچ رہی تھیں۔ ہم اِس انتظار میں تھے کہ کوئی آ کر تیرا راز فاش کرے، مگر افسوس کہ کسی کو بھی تیرے خلاف داد خواہ ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر ہم نے تیرا بھانڈا پھوڑ ڈالا ——— بدبخت! تُو نے ہماری انگشتری کو بھی نہ پہچانا——؟

—— لا پیش کر!"

کوتوال نے جیب سے انگشتری نکال کر سر اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے خدمتِ اقدس میں پیش کی۔ اور گڑگڑا کر معافی کا خواستگار ہوا۔

بادشاہ نے حقارت سے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا:۔

"اتنی کرتوتوں کے بعد بھی معافی کا خواستگار ہے؟ مجھے دُنیا میں بدنام کیا۔ میرے مُلک میں آنے والے پردیسیوں کو اِس طرح لُوٹا، جس طرح گدھ اور کُتّے مُردہ لاش کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نوچتے ہیں۔ اگر تجھے کُھلے بندوں چھوڑ دوں تو تیرے بھائی جو بنگال اور دکن جیسے دُور رس مقامات میں بیٹھے ہیں، وہ کیا کچھ نہ کریں گے —— کوتوال! تم آج نوکری سے برطرف کیے جاتے ہو!" —— وزیرِ اعظم کی طرف خطاب کرتے ہوئے —— "وزیر صاحب! اِس بدذات کو گدھے پر سوار کرا کے شہر میں پھراؤ، اور جن مظلوموں کا یہ مال لُوٹ چکا ہے ایک مکمل فرد تیار کر کے اس کی جیب سے ان سب کی حق رسی کرو۔ جب لوگوں کا پیسہ پیسہ ادا ہو جائے تو اِسے بنگال کی طرف نکال دو!"

پھر بادشاہ نے بھٹیارے اور بھٹیارن پر قہر آلود نگاہ ڈالی۔ فرمایا

"انہیں بھی اسی وقت شہر سے نکال دو۔ اور ان کا کُل سرمایہ سرائے

والوں میں بانٹ دو!"

شیخ سالم ابھی تک دست بستہ کھڑا تھا۔ جہانگیر نے گلے سے قیمتی مالا اُتار کر اس پہ پھینکی۔ اور عورت سے، جو کہ شاہی محل کی خادمہ تھی، فرمایا

"جا، ملکہ تجھے راضی کرے گی!"

اتنے میں پسِ پردہ کو حرکت ہوئی اور ایک مرصّع ہار خادمہ کے گلے میں آپڑا۔

شہنشاہ نے مسکرا کر سالم سے فرمایا۔

"کوتوال نے کچھ نہیں کیا۔ اگر تجھے حوالات میں ڈال کر اپنے سپاہیوں سے پٹواتا تو بڑا مزہ آتا!"

اِس فقرے سے خوب لطیفہ ہوا اور سہما ہوا دربار ایک دفعہ پھر گرم ہو گیا!

○

تُوزکِ جہانگیری

کا

ایک ورق

"میں تجھے کشتنی اور گردن زدنی سمجھتا ہوں، اِس لئے نہیں
کہ تُو نے مجھے شرابی کہا اور نہ اِس لئے کہ تُو نے میرے سر
کی قسم کی پرواہ نہ کی، بلکہ اِس لئے کہ تُو ایک شریف عورت
کی آبرو لینے آیا!"

(جہانگیر اعظم)

بچپن سے یہ بات میرے ملاحظہ سے گزر رہی تھی کہ مظلوم لوگوں کو بادشاہ تک پہنچنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور جو "عرض بیگی" یا ہر کی رپورٹیں حضور میں عرض کرنے پر مقرّر رہیں۔ وہ بڑی رشوتیں لینے کے باوجود بھی صحیح واقعہ بادشاہ کی خدمت میں نہیں پہنچنے دیتے۔ اس سے بادشاہ کو داد رسی میں دِقّتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میرے والد ماجد (اکبر اعظم) نے درشن کا طریقہ اسی غرض سے جاری کیا تھا کہ اگر کسی کو براہِ راست اپنے بادشاہ سے کچھ عرض کرنا ہو تو کہہ دے۔ مگر اس موقع پر امراء کا اتنا ہجوم ہو جاتا کہ فریادی ان کی موجودگی میں کچھ عرض نہ کر سکتے تھے!

(۲)

میں نے ان تمام امور پر اچھی طرح غور و فکر کرنے کے بعد حکم دیا کہ بیس من خالص سونے کی ایک زنجیر بنائی جائے۔ اس کا ایک سِرا میرے محل کے مشمن برج سے آویزاں کیا جائے اور دُوسرا ایک پکّے

مینار سے، جو بر لب دریا واقع ہے، باندھا جائے۔ زنجیر سے گھنٹے باندھ دیئے جائیں تا کہ جب فریادی اُسے ہلائے۔ تو ان گھنٹوں سے ایسی بے ہنگم آواز پیدا ہو کہ میں محل کے جس کونے میں بھی ہوا کروں، اس کی آواز سُن کر فریادی کے پاس آسکوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے خبر رسانی کا ایک وسیع محکمہ بنایا۔ ہر امیر کے ساتھ کوئی نہ کوئی مخبر لگا رہتا جو اس کی کارگزاریوں سے مابدولت کو روزانہ اطلاع دیا کرتا۔ میں نے محل کا ایک گوشہ محض ان خبروں کے سننے کے لئے خاص کر رکھا تھا۔ رات کو یہاں ہر وقت پرچہ نویس آکر مجھ سے ملاقات کر سکتے تھے بالعموم میں ہمیشہ اسی جگہ سویا کرتا تھا۔ اگر حرم سرا میں سوتا تو یہاں ایک رازدار خواجہ سرا موجود رہتا جو ضرورت کے وقت مجھے حرم سرا میں آکر اطلاع دیتا تھا۔

(۳)

ایک رات مجھے ایک مخبر نے آکر جگایا اور گھبرا کر کہا "جلدی کیجئے حضور، ورنہ ایک پاک دامن عورت کی عصمت برباد ہو جائے گی میں فوراً کھڑا ہو گیا۔ دل میں خیال گزرا۔ ہو سکتا ہے کہ پرچہ نویس میرے کسی دُشمن کے ساتھ ملا ہوا ہو اور بُری نیّت سے میرے پاس آیا ہو، مگر اُسی وقت میں نے اپنے پروردگار کی طرف سے اپنے اندر ایک

روشنی دیکھی، جس سے مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ شخص دھوکہ باز نہیں ہے چنانچہ تلوار اُٹھا، حافظِ حقیقی کے بھروسے پر اس کے ساتھ چل پڑا۔

(۴)

راستے میں پرچہ نویس نے بتایا کہ رات کو جب ملزم بے وقت گھر سے نکلا تو میں نظر بچا کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ ایک غریب عورت کے مکان میں گھس گیا اور میں دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سُنا کوئی عورت گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی ہے۔

"تجھے بادشاہ کے سر کی قسم! میری آبرو خراب نہ کر!" پھر مجھے دھکم دھکا کی آواز آئی۔ جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ عفیفہ اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اس پر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں جہاں پناہ کی خدمت میں دوڑا آیا۔

پرچہ نویس کے اس بیان سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اور غم و غصہ سے میرا خون کھولنے لگا۔ ہم ایسے وقت اس مظلومہ کے گھر پہنچے، جبکہ وہ بدکار امیر اس خاتون کے ساتھ لپٹا ہوا کہہ رہا تھا کہ اگر تُو میرا کہا مان لے تو میں تجھے اپنی بیگم بنا لوں گا۔ اور تیری ساری عمر عیش و مسرت میں گزرے گی۔ لیکن وہ پاک دامنہ برابر انکار کرتی رہی کہ میں شریف ہوں، اور شریف عورتیں اپنے غریب خاوندں

کو امیروں سے بھی اچھا سمجھتی ہیں !"

میں کچھ دیر تک اوٹ میں کھڑا ہو کر دونوں کی باتیں سُنتا رہا۔ اور دونوں کو دیکھتا بھی رہا۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی کہ میں اپنی ایک مظلوم رعایا کی امداد کے لئے بروقت پہنچ گیا تھا۔

امیر نے گرج کر کہا کہ اگر تُو نے انکار کیا تو میں تجھے اور تیرے خاوند کو قتل کر دوں گا۔ عورت نے دلیری سے جواب دیا کہ میرا بادشاہ میرے خدا کا نائب ہے، وہ تجھے اِس گناہ کی سزا دینے کے لئے آپہنچے گا!

امیر بولا:۔"اری کم بخت! وہ شرابی تو محل میں پڑا سوتا ہوگا اُسے تیرے حال کا کیا علم !"

(۵)

امیر اَب حد سے بڑھا جارہا تھا۔ میں نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ تلوار میان سے نکال کر آگے بڑھا۔ امیر نے خیال کیا شاید عورت کا شوہر آگیا ہے۔ وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا اور چاہتا تھا کہ مجھ پر وار کرے کہ برابر سے میرے خفیہ نویس نے پکار کر کہا:۔

"با ادب، با ملاحظہ ہوشیار ـــ جہاں پناہ سلامت !"

یہ سنتے ہی امیر کانپ اُٹھا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ میرے قدموں میں جُھک کر کہنے لگا۔"حضور سے انصاف کی بھیک مانگتا

ہوں۔ یہ عورت میری کنیز ہے اور بھاگ کر یہاں آ چھپی ہے۔"
میں نے عورت سے متوجہ ہو کر پوچھا "کیا یہ درست ہے؟"
وہ بے چاری مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی اُس نے
ڈرتے ڈرتے کہا:۔
"جہاں پناہ! یہ شخص غلط کہتا ہے۔ میں حضور کے چوبدار دلاور
خاں کی بیٹی اور جناب کے جاں نثار سپاہی قائم بیگ کی بیوی ہوں۔"
میں نے پھر امیر سے سوال کیا "کیا یہ عورت سچ کہہ رہی ہے؟..
... اگر یہ عورت تیری کنیز ہے تو اس کا نام بتاؤ! —— تُو نے
اسے کب خریدا؟ —— کتنے کو خریدا؟ —— کہاں سے خریدا؟"
امیر میرے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا۔ رو کر عرض کی :۔
"حضور! خطاوار ہوں۔ مجھ پر رحم فرمایا جائے!"
میں نے کہا "مجھ سے رحم چاہتے ہو؟ ایک شرابی سے؟ اس عورت
نے تجھے میرے سر کی قسم دی اُس وقت تجھے کچھ خیال نہ آیا۔ بلکہ تُو نے
نہایت بے حیائی سے میری موجودگی میں جواب دیا کہ بادشاہ شرابی ہے
اور وہ محل میں پڑا سوتا ہو گا! —— اس میں شک نہیں کہ ہم شراب
پیتے ہیں، لیکن غفلت اور بدمستی کا الزام محض تہمت ہے۔ میں
تجھے کشتنی اور گردن زدنی سمجھتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ تُو نے مجھے شرابی

کہا۔ اور نہ اس لئے کہ تُو نے میرے سر کی قسم کی پرواہ نہ کی، بلکہ اس لئے کہ تُو ایک شریف عورت کی آبرو لینے آیا۔ اور غریب عورت کو ستایا۔"

(۶)

یہ کہہ کر میں نے تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ امیر کا سر کٹ کر دُور جا پڑا۔ پرچہ نویس کو حُسن کارکردگی کے صلہ میں سو اشرفیاں عطا کیں۔ عورت سے فرمایا کہ تُو میری رعایا کے لئے نیک نمونہ ہے۔ ہم تیری پاکدامنی سے بہت خوش ہوئے۔ اور تیرے خوش قسمت خاوند کو مقتول امیر کی منقولہ و غیر منقولہ ساری جائیداد بخشی۔ اب تم واقعی ایک امیر کبیر کی بیگم ہو"۔ یہ کہہ کر میں اپنے محل کو لوٹ آیا۔

(آزاد ترجمہ)

○

قمر النساء بیگم

ریاست نجم پور کی غیور شہزادی

"آپ اس دھوکے میں نہ رہیں کہ مجھے والدِ مرحوم کے قاتل کا پتہ نہیں۔ میں اگر چاہوں تو آپ کو اپنے پیارے والد کے قصاص میں قتل کرا سکتی ہوں، لیکن کیا کروں، اسلامی معاشرہ اس امر کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ میرے شہر میں بطورِ مہمان تشریف لائے ہیں اور مہمان کا کام تمام کرنا اسلامی آئین کے خلاف ہے۔"

(قمر النساء بیگم)

قمرالنسار نواب احسان اللہ خاں والیٔ نگم پور کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ابھی اُس نے اِس دارِ فانی میں آنکھ بھی نہیں کھولی تھی کہ قضائے قدر نے اُسے ماں کی شفقت سے محروم کر دیا۔ اس لئے نواب نے اسے دایہ کے سپرد کر دیا۔ اور جب سِن شعور کو پہنچی تو نگم کی ایک دانشمند اور فاضلہ خاتون حمیدہ خانم کو اس کی تعلیم و تربیت پر مقرر کیا۔ جس نے اُسے تھوڑے سے عرصہ میں نہ صرف قرآن حفظ کرا دیا، بلکہ علوم متداولہ میں بھی یکتا کر دیا۔

نواب احسان اللہ خاں خود کئی زبانوں کے عالم تھے۔ جب ریاست کے امور سے تھک ہار کر محلسرائے میں تشریف لاتے تو قمرالنسار کی عاقلانہ گفتگو، معاملاتِ شاہی کی تکمیل کے لئے انہیں دوبارہ تازہ دم کر دیتی تھی۔ اُن دنوں انگریز بنگال پر چھا چکے تھے اور وہ سیلاب کی طرح شمال مشرق کو بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اگر

وہ صرف تلوار سے کام لیتے تو شاید فورٹ ولیم سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکتے۔ لیکن وہ ہندوستان پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لئے وہ ہر قسم کے مکر و فریب کو جائز سمجھتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مشہور شاطر کلائیو جس نے انتہائی بزدلی سے شہیدِ وطن نواب سراج الدّولہ سے پلاسی کا معرکہ جیتا تھا، اب یہ معمول بنا چکا تھا، کہ پہلے تو وہ ہندوستانی نوابوں اور رئیسوں کا دوست بن کر ان کے محلات کے راز معلوم کرتا اور پھر انہیں مجبور کرتا کہ وہ ریاست' یا جاگیر انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ کئی عاقبت نااندیش نواب اور رئیس اس کی مکروہ سیاست پر اپنی جاگیریں قربان کر چکے تھے۔ آجکل اس کی توجہ نگم پور کی حسین وادی پر مرکوز تھی۔ ایک دن نواب کے ساتھ دیر تک اس کی رازدارانہ گفتگو ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ دوپہر کا کھانا بھی نواب نے مردانے میں طلب کر لیا۔ شام کو کافی رات گئے نواب صاحب محل میں تشریف لائے تو قمر النساء کو اپنا منتظر پایا۔

خدا معلوم کیا وجہ تھی کہ شہزادی کا دل انگریز کی آمد سن کر ڈوبا جاتا تھا۔ سراج الدّولہ کی تباہی و بربادی کا خونیں نقشہ اسکی نگاہوں میں پھر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا والد بھی ایسے مکار، اور دغاباز لوگوں سے مراسم رکھے۔ اس لئے جونہی نواب صاحب اندر آگئے

وہ سرو قد کھڑی ہو گئی۔ اُس کے آتشیں رخساروں پر زلفیں لہرا رہی تھیں اور دلکش آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک رہے تھے۔ نواب نے گھبرا کر لختِ جگر کو سینے سے لگا لیا، اور سر پہ بوسہ دے کر بولا

"اے نُورِ چشم! یہ حزن و ملال کیوں ہے؟"

"ابا جان..... !" شہزادی نے گلو گیر آواز میں کہا..." ماں کی شکل یاد نہیں، اور اتنے بڑے محل میں سوائے آپ کی ذات کے کوئی مونس و غم خوار نہیں۔ سارا دن اور اتنی رات حضور نے باہر گزار دی اور خادمہ کا خیال تک نہ فرمایا۔ اگر حضور بھی بھلا دیں تو پھر اس بے ماں کی بچّی کا کیا بنے گا؟"

نواب کا دل بھر آیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے۔ بولا:-

"اے راحتِ رُوح! محض تیری خاطر میں نے دُوسری شادی نہیں کی۔ اچھے سے اچھے گھر ملتے تھے لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی عورت سوتیلی ماں کا روپ دھار کر میری قمر کے لئے سوہانِ روح کا موجب بنے میں جوانی کی منزلوں سے گزر کر عالمِ پیری کی سرحد تک پہنچ گیا۔ ستّر سالوں کے لیل و نہار اد لتے بدلتے دیکھ چکا ہوں مصیبتوں کے بوجھ میرے کندھوں پر اتنے عظیم بار رکھ چکے ہیں کہ اب اس سے زیادہ مجھے اس

دُنیا میں رہنے کی مہلت کا ملنا مشکل ہو گیا ہے۔ اب میری آنکھیں رب الارباب کے باب رحمت پر لگی ہوئی ہیں۔ چاہتا ہوں کہ ریاست کا خاطر خواہ انتظام کر جاؤں۔ تاکہ نُورِ چشم قمرؔ کو میرے بعد تکلیف نہ ہو چنانچہ آج سارا دن اسی فکر میں گزرا۔ ایک دوست آئے ہوئے تھے اُن سے مشورہ ہوتا رہا اور یہ وقت آگیا۔"

"آخر کیا سوچا ہے حضور نے؟" قمر النسّاء نے فکر مند ہو کر کہا۔

"میرے مہمان لارڈ کلائیو ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل!"

"یعنی نواب سراج الدّولہ کے قاتل؟" —— شہزادی نے متنفرانہ انداز میں بوڑھے باپ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹی، یہی سمجھ لو! وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی ریاست اُن کے انتظام میں دے دوں، وہ ہر سال ایک معقول رقم ہمیں ادا کرتے رہیں گے!"

"تو کیا آپ ریاست کو بیچنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں بیٹا! یہ ایک قسم کی مستاجری ہو گی۔ ریاست ہماری رہے گی وہ بطورِ مستاجر کے اس کا انتظام کریں گے ....."

نواب صاحب بولتے بولتے خاموش ہو گئے۔ شہزادی کچھ دیر سوچتی رہی اور پھر اس ادا سے سر اُٹھایا، جیسے اُس نے کوئی اٹل فیصلہ کر لیا ہے

"نہیں ابا! ایسا نہ کیجئے!"

"اچھا میں نہیں کروں گا۔ لیکن افراتفری کے اس دور میں میرے بعد ریاست کا انتظام کیونکر چلے گا!"

"ابا جان! بعد کا معاملہ خدا پر چھوڑیئے، اپنے جیتے جی ریاست کو خطرے میں نہ ڈالیئے۔ یہ لوگ پہلے مستاجر بنتے ہیں۔ پھر ہڑپ کر جاتے ہیں!"

"بہتر بیٹا! جیسے تم چاہو گی، ویسا ہو گا!"

دُوسرے دن نواب نے کلّابو کو صاف جواب دے دیا اور وہ بظاہر اس طرح مرشد آباد کو روانہ ہُوا گویا کوئی بات اس کی طبع کے خلاف نہیں ہوئی۔ لیکن درپردہ وہ یہ فیصلہ کر کے چلا تھا کہ نواب کو زندہ نہیں رہنا چاہیئے۔ اِس واقعہ کو چند دن گزرے تھے کہ رحمت خاں نامی خواجہ سرا دفعتہً گم ہو گیا۔ نواب کو بڑی تشویش ہوئی۔ ریاست کے ہر گوشہ میں آدمی دوڑائے، اس کے گھر سے پتہ کیا، مگر کوئی سُراغ نہ ملا۔ کچھ عرصہ بعد، جبکہ محل کے تمام غلام اور نواب تک اُسے بھُول چکے تھے۔ وہ از خود حاضر ہو گیا۔ نواب نے اُسے لعنت ملامت کی اور پوچھا کہ اتنے دن کہاں رہا اور بلا اجازت

کیوں بھاگ گیا۔ اُس نے ہر چند کئی عذر تراشے مگر قبول نہ ہوئے۔ نواب نے اُسے ملازم رکھنے سے صاف انکار کر دیا کہ اب تم اعتماد کے لائق نہیں رہے، اور بے اعتماد آدمی کا ملازم رکھنا دانش مندی کے خلاف ہے۔ وہ قدموں پر گر پڑا اور رو کر بولا کہ خداوند نعمت کا دروازہ چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ میں تو یہیں جیوں گا اور یہیں مروں گا۔ محل کے دُوسرے خدام نے بھی سفارش کی جس پر رحمدل نواب کو ترس آ گیا اور اُس نے معاف کر دیا۔ دراصل رحمت خاں کو کلائیو نے خاص آدمی بھیج کر طلب کیا تھا۔ یہ کم بخت نواب علی وردی خاں کے زمانے میں مُرشد آباد کے محلات میں ملازم تھا۔ جب وہ فردوس بریں کو سدھار گئے تو یہ میر جعفر کا نوکر ہو گیا۔ میر جعفر کو اس پر بڑا اعتماد تھا۔ جب کوئی خط کلائیو کو بھیجنا ہوتا اسے روانہ کرتا تھا۔ چنانچہ یہ کلائیو سے خاصہ بے تکلف تھا۔ جب وہ نجم پور کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے اسے بھی پر چڑھایا کہ نواب کو ٹھکانے لگا دو تو مُنہ مانگا انعام ملے گا۔ چنانچہ یہ کلائیو سے زہر لینے کے لئے مرشد آباد بھاگ گیا تھا۔ اُس شاطر نے اسے زہرِ ہلاہل کی پُڑیا اور پانچ ہزار روپے پیشگی انعام میں دیئے اور وعدہ کیا کہ نواب کے مرنے پر دس ہزار روپے اور دوں گا!

رحمت خاں کھانے میں تو بے ایمانی کر نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ شہزادی خود نواب کا کھانا تیار کرتی تھی اور اپنے سامنے کھلاتی تھی۔ البتہ کسی کسی وقت نواب آبدار سے پانی لیا کرتا تھا۔ ایک دن آبدار کسی کام کو گیا ہوا تھا کہ نواب کو پیاس لگی اور اس نے شربت طلب کیا۔ رحمت تو اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ اُس نے فوراً زہر کی پڑیا نکالی اور شربت میں ڈال دی۔

اتفاق سے نواب اکیلے بیٹھے تھے۔ رحمت خاں نہایت ادب سے بھیگی بلی بنا گلاس لئے حاضر ہوا۔ نواب نے مسکرا کر رحمت خاں کی طرف دیکھا اور کہا:۔

"رحمت خاں! تم کافی عرصہ میرے ولی نعمت نواب علی وردی خان کے ملازم رہ چکے ہو۔ اِس لئے میں تمہارا بڑا خیال رکھتا ہوں۔ اگر کوئی اور نوکر چلا جاتا تو مجھے قطعاً افسوس نہ ہوتا، لیکن تم میرے نوکر نہیں بلکہ بھائی کی مانند تھے ....."

رحمت خاں کے ہاتھ سے شربت کا گلاس لے کر میز پر رکھ دیا اور پھر کہنا شروع کیا:۔

"میں اب چراغِ سحری ہو رہا ہوں۔ خدا معلوم کس وقت بُلاوا آ جائے میری قمر کا خیال رکھنا!"

رحمت خاں حیرت سے بُت بنا کھڑا تھا۔ نواب کی تقریر اس کے دل

پر آدرے کا کام کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا میرا یہ اقدام درست ہے؟ کیا ایسے ماتحت پرور آقا کو زہر دینا مناسب ہے؟ اس کے قلب و دماغ میں ابھی یہ کش مکش جاری تھی کہ بُوڑھے نواب نے شربت کا گلاس مُنہ سے لگا لیا۔ شربت کے پیتے ہی نواب کا سر چکرانے لگا۔ اُس نے رحمت خاں سے کہا۔

"برخوردار! سر پھٹا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے جلدی حکیم کو بلا لاؤ!"

اور خود بڑے صبر و ضبط کے ساتھ محلسرا کو روانہ ہُوا۔

زہر دم بدم اپنا اثر کر رہی تھی۔

"قمر!... قمر!!... کہاں ہو؟" اس نے کرب انگیز آواز سے چلّا کر کہا۔

نواب دھڑام سے بستر پر گر پڑا، اور خواجہ سرا دوڑ کر آ گئے۔

نواب نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"اُف! ابھی تک حکیم نہیں آیا۔ کم بخت رحمت خاں کہاں مر گیا!"

رحمت خاں کہاں تھا۔ وہ تو اپنا کام کر کے مرشد آباد جا چکا تھا۔

اُسی وقت چند خواجہ سرا دوڑے اور حکیم کو بُلا لائے۔ اُس نے دیکھتے ہی کہا کہ نواب کو زہر دیا گیا ہے۔ ایک خواجہ سرا دوڑ کر دیوان خانے سے گلاس اُٹھا لایا۔ حکیم نے اُسے محفوظ کر لیا۔

نواب شدّت درد سے پڑا کراہ رہا تھا۔ حکیم نے قے آور دوائیں دیں اور زہر کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کی، مگر اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور نواب کی حالت "متغیر" ہو گئی۔ حکیم مایوس ہو کر لوٹ گیا شہزادی لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور چیختی چلاتی باپ کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس کا رنگ زرد اور جسم سرد ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل آئے اور کاجل کی دھاریں رخساروں پر بہہ نکلیں۔ روتی ہوئی بولی :۔

"پیارے ابّا! تجھے کیا ہو گیا۔ کیا سچ مچ تم جا رہے ہو؟"

اُس نے دیوانیوں کی طرح نواب کے چہرے پر نظر ڈالی اور بولی :۔

"نہیں نہیں ...... میں آپ کو نہیں جانے دوں گی!"

لپک کر باہر نکلی۔ خواجہ سرا اور داسیاں باہر حکم کی منتظر بیٹھی تھیں۔

شہزادی نے چیخ کر کہا :۔

"تمہارا آقا سخت تکلیف میں ہے۔ خدا کے لئے دوڑو اور شہر کے تمام ڈاکٹروں اور حکیموں کو بلا لاؤ۔ اُنہیں کہو کہ اگر نواب صاحب موت کے مُنہ سے بچ گئے تو تمہیں منہ مانگا انعام ملے گا!"

نوکر چاکر ایک دفعہ پھر شہر کو دوڑے اور حکیموں ڈاکٹروں کو اکٹھا کر لائے۔ سب نے نواب کو حسرت بھری نظر سے دیکھا اور کہا :۔

"شہزادی سے کہو، تقدیر سے چارہ نہیں۔ نواب موت کے منہ میں جا چکا۔ اب انہیں واپس لانا بندوں کا کام نہیں۔"

یہ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ نواب پر نزع کا عالم طاری تھا اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

"قمر.... قمر.... ! میری یتیم بچی.... میرا نگم.... خدا حافظ.... !"

ایک ہچکی لی اور رخصت ہو گیا۔ شہزادی نے ایک ہولناک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔

شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ نواب اپنی رعایا میں مقبول تھا اور شہزادی سے تمام امیر زادیاں بے پناہ اُلفت رکھتی تھیں۔ اس لئے ہر کہ ومہ اظہارِ افسوس کے لئے جمع ہو گیا۔ شہزادی نواب کے قدموں سے چمٹی پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری تھا، اور زبان سے اس قسم کے درد انگیز اشعار نکل رہے تھے :۔

"اے قمر کے ابا! اے نگم کے والی!
اپنی خادمہ سے کیوں رُوٹھ گیا
جبکہ باپ بیٹے میں اخلاص نہیں
جبکہ بھائی بھائی کا دشمن ہے
جبکہ مکار انگریز نگم کو ہڑپ کرنے کی فکر میں ہے۔

تیری یتیم بچّی کا کیا بنے گا —!

ایک دُنیا انتظار میں ہے
امیر و وزیر تیری راہ تک رہے ہیں
کیا تُو سب سے رُوٹھ گیا —؟

اے بے ماں کی بچی — رو! — دل کھول کر رو!!
آج دُنیا میں تیرا کوئی نہیں رہا!
ماں رُخصت —!
باپ رُخصت —!!"

شہزادی باپ کی اس بے وقت موت کے لئے تیار نہ تھی چند دن تک وہ دُنیا وما فیہا سے بالکل بے خبر ہو کر نازبردار باپ کا ماتم کرتی رہی۔ لیکن ایک دن جب کہ ایک بیوہ اپنے چند یتیم بچوں کو لے کر خیرات و صدقات کے لئے حاضر ہوئی۔ دفعتہً اس کی کایا پلٹ گئی۔ اس کی وارفتگی اور دیوانگی ختم ہو گئی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان بچوں کو دیکھا اور عورت سے پوچھا۔

"کیا سچ مچ یہ بھی یتیم ہیں؟

کیا اِن کا باپ بھی مر گیا ہے؟؟

بالکل میری طرح ——— ؟؟؟"

"جی سرکار! ——— مگر تیری طرح کیسے؟ ——— تیرا اقبال تیرے ساتھ ہے! ——— تُو لاکھوں کروڑوں کی مالک! یہ ایک ایک ٹکڑے کے محتاج!! ——— تیرے ادنیٰ اشارے پر لاکھوں سر دینے کو تیار، لیکن ان کا سوائے مجھ بڑھیا کے کون ہے؟ ——— تُو ریاست کی والی! ——— یہ در در کے سوالی!!"

شہزادی کو دفعتہً محسوس ہوا کہ وہ تنہا نہیں، وہ ریاست کی ملکہ ہے، ہزاروں نوکر چاکر، خدم حشم اس کے حکم کے منتظر ——— ! اس کی کچھ ذمہ داری ہے ——— باپ کی رعایا اس پر کچھ حق رکھتی ہے! ——— ریاست کے فریادی اُسے پکار رہے ہیں۔ نگم کے یتیم بچے اس سے قوتِ لایموت کے طلب گار ہیں!

وہ فوراً ہوش میں آگئی۔ ناظرِ محلات احمد جان کو طلب کر کے حکم دیا کہ ان یتیم بچوں کا مستقل وظیفہ مقرر کر دو۔ اور جب تک یہ جوان نہ ہو جائیں، یہ روزینہ اُنہیں برابر ملتا رہے۔ اور ہاں! دیوان جی سے کہو کہ شہر کے تمام محتاجوں، یتیموں اور مسکینوں کی فہرست تیار کی جائے

تاکہ ان کی گزر اوقات کا انتظام ہو سکے۔ بندی خانے میں جو مجرم قید پڑے ہیں انہیں نیک چلنی کی ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ مسجدوں، تکیوں مندروں اور پاٹھ شالاؤں کے لئے اوقاف مقرر کئے جائیں تاکہ خدا یاد لوگ اطمینان سے مصروفِ عبادت ہو کر میرے باپ کے حق میں دُعا کر سکیں!"

ریاست کے انتظام میں شہزادی کی دلچسپی روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف وہ باپ کے صدمہ کو بھول گئی، بلکہ ریاست کو بھی چار چاند لگ گئے۔ رعایا خوشحال اور آسودہ ہو گئی۔ ہر طرف سکون و اطمینان کا ہُن برسنے لگا۔

کلائیو اب کلکتہ پہنچ چکا تھا۔ یہ علم نہیں ہو سکا کہ رحمت خاں کو نمک حرامی کا کیا صلہ ملا۔ اِس واقعہ کے بعد وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ عام خیال یہی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے شاطر نے اُسے ٹھکانے لگوا دیا ہو گا تاکہ رازِ فاش نہ ہو!

کلائیو قمرالنساء کے حُسنِ خداداد کی شہرت سُن چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اب وہ بہت بڑی ریاست کی واحد مالک ہے۔ اگر وہ ہتھے چڑھ جائے تو پھر کیا کہنا۔ چنانچہ اس نے پہلے ایک خط لکھا جس میں نواب کے بے وقت انتقال پر اظہارِ افسوس کیا۔ اس کے بعد اس نے

پھر وہی خدمات پیش کیں کہ عورت ذات سے کسی ملک کا انتظام ناممکن ہے۔ ریاست میں بدنظمی پھیل جائے گی۔ اور آمدنی گھٹ جائے گی۔ بہتر ہے کہ آپ جاگیر ہمارے انتظام میں دے دیں۔ تاکہ آپ کا عیش و آرام منغّص نہ ہو!"

تعزّیت نامہ کا شہزادی نے شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ اگر ریاست کے انتظام میں کوئی دقّت پیش آئی تو اِس پہلو پر غور کیا جا سکے گا۔ بہر دست کام اچھا چل رہا ہے اور ہم لوگ آباؤ اجداد سے رعایا کی غور و پرداخت میں ہی عیش و آرام محسوس کرتے چلے آئے ہیں۔

جب اِس طرح کلائیو کا مطلب حاصل نہ ہوا تو اس نے محل کے خواجہ سراؤں، اصیلوں اور ڈومنیوں پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ لیکن اس میں بھی اُسے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اب اس نے ایک اور پھندا تیار کیا۔ اُس نے شہزادی کو خط لکھا کہ :-

"میں انگلستان جا رہا ہوں، اگر تم جانا چاہو تو مجھے خوشی ہو گی تم وہاں کے شاہی محل کی معزز مہمان بنو گی اور شہزادی تمہیں اپنی سہیلی بنالے گی!"

شہزادی نے لکھا کہ :-

"آپ کی عنایت کا شکریہ! یہ بندی انگلستان کی شہزادی بننے

کی کوئی خواہش نہیں رکھتی، خدا نے اسے نگم پور کی ملکہ کا اعزاز بخشا ہے اور اسی پر وہ خدائے لایزال کا شکر بجالاتی ہے!"[1]

اس خط نے کلائیو کی توقعات پر اوس ڈال دی مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس بہت بڑے شاطر کے لئے جس نے مکروفریب سے ہندوستان کے کئی معرکے سر کئے تھے۔ بوالہوسی کے میدان میں اتنی جلدی ہار مان لینا ڈوب مرنے کے مترادف تھا۔ اب وہ حصولِ مقصد کے لیے نئی گھاتیں سوچنے لگا۔

ان دنوں شہزادی کو اطراف وجوانب کے رئیس زادوں سے شادی کے پیغام موصول ہو رہے تھے۔ ایک تو وہ غضب کی حسین تھی دُوسرے بہت بڑی جاگیر کی واحد مالک تھی۔ ہر نواب زادے کے دل میں اُسے رفیقہء حیات بنانے کی اُمنگ تھی۔ ہر طرف سے نامہ وپیام کا سلسلہ جاری تھا۔ شہزادی نے یہ تمیز کرنے کے لئے کہ کون ریاست کے لالچ میں شادی کی خواہش رکھتا ہے اور کون محض اس کی ذات کا طلبگار ہے، یہ اعلان کیا کہ

"وہ اپنے ہونے والے شوہر کو اپنی جائداد سے ایک پائی تک نہ دے گی۔"

---

[1] جب کلائیو کی بے اعتدالیوں کا احتساب کیا گیا تو اس کے سیاسی مخالفین نے یہ خط برطانوی پارلیمنٹ میں پڑھ کر سُنایا تھا۔

اس کے باوجود اس قدر دعوت نامے موصول ہوئے کہ شہزادی کو شادی کے لئے اپنے شوہر کا انتخاب مشکل ہو گیا۔ وہ ایک ایک کے عقائد، خصائل اور اخلاق کی بابت سوال کرتی اور مزید اطمینان کے لئے اپنے آدمی بھیجتی جو خفیہ طور پر اُمیدواروں کے حالات کا جائزہ لے کر اُسے رپورٹ کرتے تھے۔

یہ خبر سُن کر کلائیو نے بھی قسمت آزمائی کا ارادہ کر لیا۔ اس نے غلام حسین خاں طباطبائی سے اُس زمانہ کی دیسی زبان سیکھی۔ کچھ فارسی کے اشعار یاد کیے۔ ڈھاکہ کی نفیس ململ کا انگرکھا پہنا۔ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی سر پر رکھی کالی کالی زُلفیں بڑھا شہزادہ مرزا سکندر بیگ نام رکھ قمر النسار کا اُمیدوار بن گیا۔

کلائیو جس طرح ہندوستانی نوابزادے کا سوانگ رچا کر نجم پور پہنچا اس کی تفصیل برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر کی زبان سے سُنئے۔ جس نے کھڑے ہو کر بیان کیا تھا کہ:۔

"جب انگریزوں کا بانکا ترچھا البیلا لارڈ ایک شریف ہندوستانی رئیس زادی کو جُل دینے کے لئے نواب مرحوم کے محل تک پہنچا تو اس کے ساتھ زرق برق کی وردیاں پہنے ہوئے کم و بیش سو خدّام بھی ساتھ تھے۔ نفیری بج رہی تھی اور ہر خادم کے سر پر ایک طلائی

طشت تھا جو جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ اور ان جواہرات، اور بیش بہا تحائف میں وہ تحفے بھی تھے جو مرشد آباد کے شاہی خاندان سے زبردستی وصول کیے گئے تھے۔ اِس جلوس کے ساتھ دس حسین و جمیل خادمائیں تھیں جو عظیم آباد سے کسی طرح حاصل کی گئی تھیں۔ سونے کے ایک قلمدان میں فرضی شہزادہ مرزا اسکندر بیگ کی ایک تصویر بھی تھی جسے سونے کا مرصّع تاج پہنایا گیا تھا۔ اِس شان سے انگریز نوشہ کی سواری بن ٹھن کر نگم پور پہنچی۔ کلائیو نے اپنے چہرے پر اُس زمانے کے نوابزادوں کی طرح ریشم کا ایک ہلکا سا نقاب ڈال رکھا تھا۔ جب اس کا شاہانہ جلوس نواب مرحوم کے محل کے قریب پہنچا تو خواجہ سرا نے اندر جا کر اطلاع کی کہ عظیم آباد سے شہزادہ مرزا اسکندر بیگ کی سواری آئی ہے وہ آپ سے شادی کے خواستگار ہیں، وہ اس امر کا وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کی جائیداد سے ایک پائی بھی لینے کے روادار نہ ہوں گے۔"

شہزادی نے حکم دیا کہ مرزا کو شاہانہ اہتمام کے ساتھ دیوانِ خاص میں ٹھہرایا جائے، میر خانساماں کو ہدایت ہوئی کہ مہمانوں کے مذاق کے مطابق بڑے پیمانہ پر ضیافت کا انتظام کیا جائے، میر آخور نے ہاتھی گھوڑے سنبھال لیے، خواجہ سرا اور دیگر خدام شاہی مہمانوں کے لیے بنگلوں کے کمرے کھولنے

اور انہیں مراتب کے موافق بٹھانے میں مصروف ہوئے۔ شہزادی حیران تھی کہ یہ کوئی عجیب شہزادہ ہے کہ نہ جان نہ پہچان میں تیرا مہمان۔ اور پھر نہ میری صورت سے آشنا نہ سیرت سے آگاہ، یکایک کیونکر آدھمکا۔ عظیم آباد کے رئیسوں سے وہ واقف تھی۔ ان میں کوئی مرزا سکندر بیگ کے نام کا شہزادہ نہیں تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ خواجہ سرا نے عرض کی کہ شہزادہ ملاقات کا آرزومند ہے۔

قمر النساء کو مصنوعی شہزادے کا یہ چھچھورا پن پسند نہ آیا، مگر شاہانہ وضعداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے وعدہ کر لیا کہ آج رات کو گفتگو کا موقع دیا جائے گا۔

عشاء کے بعد ناظر محلات نے مصنوعی شہزادے سے آکر عرض کی۔

"سرکار، چلیے! ملکہ نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔"

کلائیو تو اسی انتظار میں تھا۔ ایک ہمراز کو ملحقہ کمرے میں لے جا کر لباس ٹھیک ٹھاک کیا۔ اور پھر مخصوص فقرات کو دل ہی دل میں دوہراتا قصر شاہی کو روانہ ہوا۔

دروازے پر دو سفید ریش افغانی تلواریں علم کیے پہرے پر تعینات تھے۔ انہوں نے مصنوعی شہزادے کو حیرت و استعجاب سے دیکھا۔ کچھ کہنا

چاہتے تھے، لیکن ناظرِ محلات نے ان کا مُنہ بند کر دیا۔ محل کے اندر جگہ جگہ قلماقنیاں اور اصیلیں مرصّع کار چھڑیاں ہاتھ میں لیے ایستادہ تھیں۔ کلائیو باغ کی روشوں میں سے گزرتا ناظر کی راہنمائی میں ایک عظیم الشان عمارت میں داخل ہُوا۔ اس میں کافوری شمعیں روشن تھیں، چھت اور دیواریں رنگارنگ کے شیشوں سے مزیّن اور ان میں شمعوں کا انعکاسی عمل عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ فرش پر ایرانی قالین بچھے تھے۔ ان پر خوشنما صوفے اور چھوٹی چھوٹی میزیں، میزوں پر ترتیب سے قسم قسم کے موسمی پھل پڑے شہزادی کی نفاستِ طبع کا ثبوت دے رہے تھے۔ ناظر نے کلائیو کو صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مصنوعی شہزادہ تخلیے میں گفتگو کرنے کا خواہشمند تھا۔ لیکن یہاں آکر اُس نے محسوس کیا کہ ایسا موقع ملنا قرینِ قیاس نہیں، تاہم اس نے ناظر سے کہہ ہی ڈالا کہ ملاقات تخلیہ میں ہونی چاہیئے ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ پردہ کی دُوسری جانب سے آواز آئی

"شہزادی صاحبہ تشریف لے آئی ہیں اور اپنے مُوقر مہمان کو سلام کہتی ہیں۔"

"بندہ آداب بجالاتا ہے۔" کلائیو نے مراسمِ دربار کے مطابق کھڑے ہو کر کہا۔

"تشریف رکھئے! تکلیف فرمائی کا شکریہ!"

"ملاقات تخلیہ" میں ہونی چاہیئے۔" کلائیو نے تخلیہ کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

جواب ملا:۔

"شہزادہ صاحب! یہاں تخلیہ کا رواج نہیں۔ میں اہم سے اہم معاملہ کے لیئے بھی اپنے معتمد ملازمین کی موجودگی میں ملاقات کرتی ہوں۔ میری کوئی بات ان لوگوں سے ڈھکی چھپی نہیں۔ یہ سب میرے رازدار اور وفا شعار ملازم ہیں۔ آپ بے تکلف ہو کر بات کریں۔"

کلائیو رٹے ہوئے فقرات کو عظیم آبادی لب و لہجہ میں ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بولا

"میں خوب جانتا ہوں کہ میں جسم کثیف اور آپ رُوح لطیف، کہاں خاک اور کہاں عالمِ پاک!"

شہزادی نے محسوس کیا کہ مرزا کی زبان صاف نہیں ہے۔ کلائیو برابر کہے جا رہا تھا:۔

"... تاہم قاضی ہمراہ لایا ہوں۔ وقت مقرر فرما دیں!"

زبان نے بُری طرح سے لغزش کھائی اور کلائیو، بجائے "قاضی" کے "کیجی" کہہ گیا۔ شہزادی برہم ہو کر کھڑی ہو گئی کہ مرزا سکندر کے بھیس میں یہ کوئی اور شخص ہے۔ اُس نے تالی بجائی جس پر چھ مسلح قلماقنیوں نے لپک

کر کلائیو کو پہرے میں لے لیا۔ مصنوعی شہزادے کا پردہ فاش ہو چکا تھا۔ اس نے اوپر دیکھا تو چھ چمکتی ہوئی تلواریں نظر پڑیں۔ دم بخود چُپ سادھے بیٹھا تھا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کا معاملہ تھا۔ شہزادی نے غم و غصّہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا:۔

" اے میرے اجنبی مہمان! قبل اس کے کہ میں آپ کے لئے کوئی حکم دوں، میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ شہزادے کے بھیس میں کون شخص میرے محل سرائے میں داخل ہوا ہے۔ اگر آپ نے صحیح حال بتانے سے گریز کیا تو آپ کو دُنیا کی کوئی طاقت میری گرفت سے نہیں بچا سکے گی!"

کلائیو اُس وقت عجیب مخمصے میں مبتلا تھا۔ اس نے انگرکھے کے اندر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن شہزادی نے اس کی اِس حرکت کو دیکھ لیا اور کہا:۔

"آپ یہ نہ سمجھیں کہ صرف چھ تلواروں سے آپ کا سابقہ ہے' اس محل کے گرداگرد بھری ناٹ بھری رائفلوں کا پہرہ ہے۔ اگر آپ نے ریوالور سے کام لینا چاہا تو رائفلیں آپ کا بھُرتہ بنا دیں گی۔"

کلائیو نے جب دیکھا کہ اصل حال بتائے بغیر چارہ نہیں تو اس نے سر سے مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی اتار پھینکی۔ ناظر محلات نے پہچان کر کہا:۔

"اوہو! یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کلائیو تشریف فرما

ہیں ——!"

جونہی یہ نام شہزادی کے کانوں تک پہنچا۔ غیرت سے اُس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور اُس کا رُواں رُواں کانپ اُٹھا۔ اِس کے باوجود اُس نے بڑے حوصلے سے کہا:۔

"لارڈ صاحب! آپ نے یہ کیا کیا؟ کیا آپ نے یہ بھی پلاسی کا میدان سمجھ لیا تھا۔ آپ نے ایک سرسبز اور ہری بھری اسلامی سلطنت کو ناس کیا۔ نواب سراج الدّولہ اور اس کے ساتھ ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کا خون کیا۔ کیا اس پر بھی آپ کے طمع کا پیمانہ لبریز نہیں ہوا کہ آپ ایک اور اسلامی ریاست کو ختم کرنے کے لئے چڑھ دوڑے، مسٹر کلائیو! کیا آپ نہیں جانتے تھے کہ مسلمان عورت کا کسی غیر مسلم کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا۔ پھر آپ یہ سوانگ رچا کر کیوں آ دھمکے۔ آپ اس دھوکہ میں بھی نہ رہیں کہ مجھے والدِ مرحوم کے قاتل کا پتہ نہیں۔ میں اگر چاہوں تو آپ کو اپنے پیارے والد کے قصاص میں قتل کرا سکتی ہوں۔ لیکن کیا کروں، اسلامی معاشرہ اس امر کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ میرے شہر میں بطور مہمان تشریف لائے ہیں اور مہمان کا کام تمام کرنا اسلامی آئین کے خلاف ہے۔ آپ اسی وقت تشریف لے جائیں۔ نگم پور کا کوئی متنفّس آپ کو اور آپ کے شہدوں لفنگوں کو صبح کے وقت یہاں نہ دیکھے، ورنہ آپ کے سارے قافلے کو

ٹکڑے ٹکڑے کر کے گوشت چیلوں اور کتوں کے آگے پھینکوا دیا جائے گا!"
کلائیو خفیف ہو کر اٹھا اور اسی وقت اپنے جلوس کو ہمراہ لے، کلکتہ کو روانہ ہو گیا!

شہزادی کا قلب و دماغ اس حادثہ سے بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ کمرہ میں اگرچہ کافی روشنی تھی۔ لیکن اسے ہر جانب دھندلکا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر باہر نکلی۔ آسمان پر ستارے خوب چمک رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں:۔
"قمر! تو زمین کے قابل نہیں رہی۔ آسمانوں کی بلندیوں پر ہمارے ہاں چلی آ!"
وہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں پہنچی۔ خادماؤں نے طلائی پلنگ پر مخملیں بستر لگا رکھا تھا۔ تکیہ پر ہر جانب چنبیلی کے تازہ پھول بکھرے پڑے تھے۔ داستان گو راحت سرو قد کھڑی ہو گئی کہ شہزادی پلنگ پر آرام کرے تو وہ اسے معمول کے مطابق کوئی تازہ قصہ سنائے۔۔۔ کنیزیں مٹھیاں بھرنے کے لئے دیوار سے لگی حکم کا انتظار کر رہی تھیں۔ شہزادی نے سب کو رخصت کر دیا اور خود انتہائی بے قراری سے ٹہلنے لگی۔ سامنے اس کی والدہ کی تصویر آویزاں تھی۔ اس حور کا نورانی چہرہ حالیہ واقعہ پر

متاسف دکھائی دے رہا تھا۔ شہزادی ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد اسے ایسا محسوس ہُوا کہ اس تصویر میں جان پڑ چکی ہے۔ اور وہ کچھ کہہ رہی ہے ——— !

شہزادی کے کانوں میں غم انگیز لہجہ میں رُک رُک کر بے ربط جُملے سُنائی دینے لگے :-

" بیٹی قمر! ——— آج کا واقعہ ——— ہمارے خاندان کی تاریخ میں انتہائی افسوسناک ہے ——— کلائیو کو یہ جراُت کیسے ہوئی ——— کہ وہ نوشہ بن کر محل آپہنچا ——— صبح کو دُنیا تیرے متعلق کیا کہے گی ——— انہیں کیا علم کہ شہزادی نے بُلایا تھا، یا وہ ازخود بے شرمی اور بے حیائی کا مظاہرہ کرنے کے لئے چلا آیا! ..... "

شہزادی کا دَم خشک ہو گیا۔ بدن کپکپا اُٹھا۔ زبان بند ہو گئی اور آنکھوں سے سیلابِ اشک جاری ہو گیا!

وہ ماں سے کیا کہتی ——— ؟

بعض اوقات زبان دل کی کیفیات بیان کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن کہہ نہ سکی۔

بائیں جانب نواب کا قدِ آدم فوٹو آویزاں تھا۔ شہزادی نے ادھر

نظر اُٹھائی ہی تھی کہ نواب کی تصویر میں گویا جان پڑ گئی ۔ اُس نے کہا :۔

" اے نورِ نظر ! ــــ تُو نے یہ کیا کیا ! ــــ اس مردُود کو
کیوں جانے دیا ــــ خدا جانے وہ کلکتہ پہنچ کر کیا کیا گُل
کھلائے گا ! ــــ اور رعایا نے جب سیتا کو معاف نہیں کیا
تجھے کب معاف کرے گی ــــ ؟
کسی کو کیا معلوم کہ وہ خبیث از خود آیا تھا ، یا تُو نے
خط لکھ کر بلایا تھا ! ــــ ایسے ملعون کو حرم سرائے میں آنے
کی اجازت دے کر تُو نے اسلامی تہذیب اور ایشیائی
ثقافت کو داغدار بنا دیا ہے ...... ! "

شہزادی کے دل کو سخت دھکّا سا لگا ۔ سر چکرانے لگا ۔ تصویر کے ساتھ نواب کا خنجر لٹک رہا تھا ۔ شہزادی نے لپک کر اسے نیام سے نکال لیا ، اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا :۔

" ابّا جان ــــ !
مجھ سے بھول ہوئی
واقعی میں ملک پر حکومت کرنے کے قابل نہیں رہی !
میری ناتجربہ کاری نے خود میرے ہی ہاتھوں مجھے گھائل کر

دیا ہے!

میں آپ کی بیٹی ہوں!

نجم کے ایک غیرتِ مند امیر کی بیٹی ——!

مجھے کوئی فریب کار ذلیل نہیں کر سکتا......

میں آپ کے ہاں آ رہی ہوں ——!

ہاں! بہت جلدی

ابھی ——!!"

ساتھ ہی خنجر سینے میں ترازو ہو گیا اور وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی!

○

باغی پروانے

وزیرِ اعظم نے سجدے سے سر اُٹھا کر اپنے آنسو پونچھے، اور قبرستانِ شاہی کی طرف نظریں جماتے ہوئے کہا :-

"پیارے بھائی! نوکر کے لئے بڑے سے بڑا مرتبہ وکالت اور وزارت کا ہے، وہ ہمیں مل چکا۔ نوبتِ شاہی کے ساتھ ہماری جو عزّت افزائی ہوئی، یہ اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی۔ ہمارا کمال ختم ہو چکا۔ اب زوال کا آغاز یقینی ہے۔ اس کے تصوّر میں میری جہاندیدہ نگاہیں اشکبار ہیں۔ آؤ تم بھی اپنی نشیلی آنکھوں سے چند گرم گرم قطرے گراؤ۔ خدا معلوم کل کو ہمارا کیا حشر ہو!"

(احمد خاں)

سحر مے گفت بلبل باغباں را
دریں گل جز نہالِ غم نگیرد
بہ پیری مے رسد خارِ بیاباں
ولے گل چوں جواں گیرد بمیرد

شخصی حکومتوں میں جب کسی وزیر یا امیر کا درجہ بادشاہ سے بڑھنے لگتا ہے، تو اس وقت غیرت، یا مصلحتِ ملکی سے بادشاہ اس خاندان کے درپے آزار ہو جاتا ہے۔

(۱)

احمد خاں ملے زئی افغان کا خاندان عرصہ تیس سال سے احمد پور شرقیہ (ریاست بہاول پور) میں سکونت پذیر تھا۔ ۱۸۳۰ء میں جب وہ پہلی بار شیر خاں ملے زئی کے ہمرکاب یہاں آیا تھا تو وقتی ضرورت کے پیشِ نظر شہر کے ایک گوشہ میں چند مکانات تعمیر کرا لئے تھے۔ مگر

اب یہ حصّہ ملے زئی افاغنہ کے محلّات سے پٹا پڑا تھا۔ درمیان میں ایک مسجد اور عالی شان بنگلہ دائیں بائیں غلام محمدؒ خاں، محمدؒ یار خاں، اور تاج محمدؒ خاں کے خوبصورت محلّات تھے۔

سردار احمدؒ خاں نے ۱۸۵۳ء سے جبکہ وہ بخت کی یاوری سے سلطنت عباسیہ کے مدار المہام مقرر ہوئے تھے۔ اپنی رہائش مستقل طور پر اپنے نو تعمیر محل ڈیرہ مبارک میں رکھ لی تھی۔ شہر میں اپنے محلہ کے اندر جو کٹرہ احمدؒ خاں کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ ہر جمعہ کو تشریف لایا کرتے تھے۔ اپنی تعمیر کردہ مسجد میں جمعہ ادا کرتے۔ دینیات کے طلباء سے پُر لطف سوال و جواب ہوتے۔ انہیں انعام سے نوازتے، پھر اپنے بنگلہ میں چلے جاتے جہاں عصر تک ملے زئی افاغنہ سے تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا۔ شام کو واپسی ہوتی۔

یوں تو ملے زئی خاندان کا ہر بچہ شجاع تھا۔ مگر غلام محمدؒ خان کے دیکھنے سے بابرؒ و اکبرؒ کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ گندمی رنگ، دراز قد، گول چہرہ، موٹی موٹی سیاہ اور چمکیلی آنکھیں، دراز پلکیں، بلند پیشانی، بڑی بڑی سیاہ مونچھیں، ستواں ناک، پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ چوڑا سینہ، بھرے بھرے بازو، چست شیر شاہی جسم، جلال و جمال کی حسین تصویر اور شجاعت و بسالت کا زندہ پیکر تھا۔ احمدؒ خاں کا دوسرا

بھائی محمد یار خاں بھی مردانہ حسن کا مکمل نمونہ تھا۔ احمد خاں ریاست کے کاروبار میں مصروف رہتا۔ غلام محمد خاں ایک سپاہی تھا اور تلوار چلانے کے لئے ہر وقت بے تاب دکھائی دیتا تھا۔ محمد یار خاں کو گھر کے تمام معاملات تفویض تھے۔ چنانچہ اگر ناصر خاں کو اپنے بستے کے لئے تانگے کی ضرورت پڑتی تو وہ بھی اسی چچا سے آکر مانگتا۔ جب تینوں بھائی گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تو ایک دنیا ان کے جاہ وجلال کا تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتی۔

(۲)

۱۸۵۸ء میں نواب فتح خاں کا انتقال ہو گیا۔ اور صاحب زادہ رحیم یار خاں نے نواب محمد بہاول خاں رابع کے لقب سے موروثی تخت پر جلوس کیا۔ خان پور اور اللہ آباد کے داؤد پوترے، جو حکومت کی تعمیر و تخریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انہوں نے نواب کے چھوٹے بھائی صاحبزادہ گل محمد خاں کو بادشاہت کے سبز باغ دکھانے شروع کئے۔ وہ شامت کا مارا بھی ان کے جھکیے میں آگیا۔ احمد خاں وکیل السلطنت نے اپنے شیر دل بھائی غلام محمد خاں کو اس مہم پر روانہ کیا جس نے معمولی سی جھڑپ کے بعد باغی شہزادے کو گرفتار کر لیا۔
نواب صاحب اس وقت قلعہ ڈیراور میں تشریف رکھتے تھے۔

سردار احمدؒ خاں نے مجرم کو پیش کیا۔ سرکار بہاول پور غلام محمدؒ خاں کے اس کارنامے سے اس قدر مسرور ہوئی کہ بے اختیار گلے سے لگا لیا اور وزیر پر یہ عنایت ہوئی کہ نوبتِ شاہی کے ساتھ اس کی نوبت بھی بجائی گئی۔

قلعہ ڈیراور کے پُرشکوہ دروازے پر احمدؒ خاں کی نوبت بج رہی تھی۔ تمام افغان فرطِ مسرّت سے جھوم رہے تھے۔ غلام محمدؒ خاں بھائی کو مبارکباد دینے کے لئے خیمہ میں داخل ہوا، مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وزیرِ اعظم سجدے میں سر رکھے سسکیاں لے رہے ہیں۔ غلام محمدؒ خاں نے خیال کیا۔ شاید "ادائے شکر" کی صورت ہے۔ اس لئے خاموشی سے غالیچے پر بیٹھ گیا۔ وزیرِ اعظم نے سجدے سے سر اُٹھا کر اپنے آنسو پونچھے اور قبرستانِ شاہی کی طرف نظریں جماتے ہوئے کہا:۔

"پیارے بھائی! نوکر کے لئے بڑے سے بڑا مرتبہ وکالت اور وزارت کا ہے، وہ ہمیں مل چکا۔ نوبتِ شاہی کے ساتھ ہماری جو عزّت افزائی ہوئی یہ اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی۔ ہمارا کمال ختم ہو چکا اب زوال کا آغاز یقینی ہے۔ اس کے تصوّر میں میری جہاندیدہ نگاہیں اشکبار ہیں۔ آؤ تم بھی اپنی نشیلی آنکھوں سے چند گرم قطرے گراؤ۔ خدا معلوم کل کو

ہمارا کیا حشر ہو "۔

یہ کہہ کر وزیر اعظم کسی گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی نگاہیں برابر قبرستان سے ٹکرا رہی تھیں۔ چہرے سے حسرت و یاس برستی نظر آ رہی تھی۔ تیوریوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ دُنیا بھر کی حکمت و فراست ان میں سمٹ کر آ گئی ہے۔

غلام محمد خاں نے یہ سب کچھ دیکھ کر بے پرواہی سے جواب دیا۔

" بھائی! اگر مشیّتِ ایزدی کو یہی منظور ہے تو ہمارے آنسو مستقبل کی المناکیوں کو روک نہیں سکتے۔ ہم نے جس جاہ و جلال سے اقبال کے چند روز بسر کیے ہیں۔ ان کا تقاضا یہ ہے کہ بربادی پر عورتوں کی طرح ٹسوے نہ بہائیں، بلکہ اسے بھی پُر شوکت طریقے سے انجام کو پہنچائیں۔ نصیر خاں گودیگج کے خاندان کا انجام ہمارے سامنے ہے۔ احمد پور ڈائن کی طرح انہیں نگل گیا۔ آج شاہ شمس کا قبرستان ان کی قبریں دکھانے سے بھی قاصر ہے۔ چمنستانِ بہاول پور کے اس گلِ رعنا نے کسی نامعلوم خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا :۔

" مگر ان بہادروں کا نام اُن کے غیر فانی کارناموں کے سبب زندہ ہے۔ نصیر خاں ختم ہو چکا۔ لیکن بہاول پور کے سیاسی ماحول میں اس کا اثر اب تک کار فرما ہے "

نظر فسانۂ گل ختم ہو چکا لیکن!
ترے لبوں پہ حدیث بہار ہے اب تک

"ہاں تم درست کہتے ہو!" ــــــ احمد خاں نے درباری لباس پہنتے ہوئے کہا ــــ "ہم سب ملکِ عدم کے مسافر ہیں۔ ہمیں اس سفر کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہنا چاہئے۔"

یہ کہہ کر دونوں بھائی دار الامارہ کو روانہ ہوئے۔

(۳)

سردار احمد خاں کو جس امر کا کھٹکا تھا، وہ آخر ہو کے رہا۔ اس واقعہ کو چند یوم ہی گزرے تھے کہ ملے زئی افاغنہ کے اقبال کا نیرّ اعظم جو اب تک بڑی آب و تاب سے نصف النہار پہ چمک رہا تھا، غروب ہونے کے لئے بتدریج ڈھلنے لگا۔ بات یہ ہوئی کہ جب داؤد پوتروں کی سازش کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ پڑا تو وہ احمد خاں کے سخت مخالف ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ جب تک یہ شخص وزیر ہے ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے سرکار بہاول پور سے پہلے اسے ٹھکانے لگانا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے حشرات الارض کی طرح اپنے ایجنٹ اس غرض کے لئے چھوڑ دیئے کہ خلوت اور جلوت میں جہاں موقع پائیں۔ نواب صاحب کو وزیر کی طرف سے بدگمان کر دیں۔ اتفاق سے گل محمد

خاں کی بغاوت میں سیّد کرم شاہ نامی ایک ایسا شخص بھی شامل تھا جو کبھی یار محمدؐ خان کا ملازم رہ چکا تھا۔ دشمنوں کے لیے اتنی سی بات کافی تھی۔ معزّ الدین اور شیر شاہ نے سرکار کو بڑے وثوق سے یقین دلایا کہ سازش کا اصل بانی آپ کا وزیر ہی ہے۔ چونکہ فقیر سراج الدین کا واقعہ پہلے پیش آچکا تھا۔ اِس لیے نواب صاحب کو احمدؐ خاں کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ غضب یہ ہوا کہ چند ایام کے بعد گل محمدؐ خاں قلعہ ڈیرا اور سے نکل بھاگا۔ مخالفوں نے کہا:-

"سرکار! یہ سب کچھ آپ کے محبوب وزیر کے اشارے سے ہو رہا ہے۔"

درباری مشیروں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آقا کا دل اپنے نمک حلال وزیر سے منحرف ہو گیا۔ احمدؐ خاں بھی دربار کے حالات سے بے خبر نہ تھا۔ اُس نے خیال کیا۔ کہ سازش کا الزام اسی صورت میں ہی رفع ہو سکتا ہے کہ ہم گل محمدؐ خان کو دوبارہ گرفتار کر کے سرکار کی خدمت میں پیش کریں۔ چنانچہ غلام محمدؐ خاں اسی مہم پر روانہ ہوا اور اس نے بدستورِ سابق اپنی بہادری اور جوانمردی سے گل محمدؐ خاں کو گرفتار کر لیا۔ وزیرِ اعظم باغی کو لے کر حضور میں حاضر ہوا اور عرض کی:-

"یہ غلام کس لائق تھا۔ جہاں پناہ کے قبلہ گاہ نے اسے نوازا اور فرشِ خاک

سے اُٹھا کر اوجِ ثریّا پر پہنچا دیا۔ اس سے بڑا مرتبہ نوکر کے لئے نہیں ہو سکتا۔ اب اگر یہ غلام پیرانہ سالی میں نمک حرامی کا داغ پیشانی پر لگا کر کسی دُوسرے کے لئے بادشاہی کی جدوجہد کرے تو وہ بھی وزارتِ عظمیٰ سے بڑا مرتبہ نہیں دے سکتا! ـــــ اے عالم پناہ! میں سُن رہا ہوں کہ دُشمن مجھے اس سازش میں ملوّث کر رہے ہیں۔ میرے جواں ہمت بھائی نے دُوسری مرتبہ اس باغی شہزادے کو گرفتار کر کے حضُور میں پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ بندہ خود بھی حاضر ہے۔ اگر فدوی کے اخلاص پر کسی قسم کا شُبہ ہے تو یہ سر ہے اور یہ تلوار، مجھے شہادت سے سرفراز کر کے ہر قسم کے خدشے سے محفوظ ہو جائیے، ورنہ اُن بد باطن اُمرار کو دربار سے نکال دیجیے جو اِس قسم کی بے سروپا باتیں کر کے خاطرِ عاطر کو غلام کی طرف سے مکدر کر رہے ہیں۔

اقبال مند نواب نے گل محمدؐ خاں کو تو قید کر دیا اور غلام محمدؐ خاں کو خلعتِ فاخرہ اور طلائی کنگن انعام میں مرحمت فرمائے۔ وزیر سے ارشاد ہوا، کہ "تمہاری تقریر سے ہوا خواہی ٹپکتی ہے۔ تمہارے کارنامے ہی تمہاری اخلاص مندی کے شاہد ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ جو شکوک اور شبہات آپ کے اور آپ کے خاندان کے متعلق پیدا ہو گئے ہیں انہیں دل سے نکال دوں!"

یہ کہہ کر تلوار اُٹھا کر وزیر کو واپس دے دی اور فرمایا کہ بد باطن اُمرار کا دربار میں رہنا ہمیں بھی پسند نہیں۔ جب تک حکومت کے آپ وکیلِ مطلق ہیں۔

ایسے امرار کے اخراج کی آپ کو ہر وقت اجازت ہے۔ احمدؐ خاں ادائے شکر کے لئے جُھک گیا اور عرض کی۔

"معزّ الدین خاں اور شیر شاہ عرصہ سے فتنہ و فساد کی خاموش چنگاریوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ سر دست اُن کا نکالنا مطلوب ہے۔"

"بہتر!" —— نواب صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ احمدؐ خان اور غلام محمدؐ خاں دونوں رجعت قہقری کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔

(۴)

دُوسرے دن شیر شاہ کو ملازمت سے جواب دے دیا گیا اور معزّ الدین کو سرکاری کارندے دریا سے پار پہنچا آئے۔ حکومت کے بدخواہوں نے اب وزیرِ اعظم کے خلاف جھوٹی عرضیاں بھیجنی شروع کیں۔ ریتی سے میکلوڈ روڈ تک پڑھے لکھے آدمی پھیلا دیئے گئے جن کا کام وزیرِ اعظم اور اس کے خاندان کے خلاف سرکارِ عالی کی خدمت میں بے اصل درخواستیں بھیجنا تھا دربار میں اور آدمی بھرتی ہوئے۔ محل سرائے سلطانی میں بے شمار آدمی اس کام پر مقرر ہوئے کہ جب اور جہاں موقع پائیں، احمدؐ خاں کے خلاف مظالم اور استبداد کے قصّے اس طرح گھڑ گھڑ کر بیان کریں کہ سُننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اس منظم سازش کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرکارِ عالی کی میز پر روز مرّہ جو ڈاک رکھی جاتی وہ تمام و کمال علے زئی افاغنہ کی شکایات پر

مشتمل ہوتی۔ محل سرائے میں بیگمات اور خادماؤں سے سابقہ پڑتا تو وہاں بھی یہی مذکور ہوتا۔ آخر سنتے سنتے سرکار کے کان پک گئے۔ سرکار بہاول پور نے جن لوگوں کو وزیر اعظم کی حرکات وسکنات پر نگران مقرر کیا، انہوں نے اور حاشیہ آرائی کی۔ ستم یہ ہوا کہ شکایتی مراسلوں کے سلسلہ میں سرکار نے خود جو تحقیقات کی اس میں بھی بدخواہوں کی سازش کام کر گئی اور نواب صاحب کو اگر پہلے وزیر کے اخلاص پر شبہ تھا تو اب یقین ہو گیا۔ غلام محمد خاں کو پل پل کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس نے بھائی سے کہا:۔

"حالات نامساعد ہوتے جا رہے ہیں، ممکن ہے نصیر خاں گوریج کی طرح ہم بھی عتاب شاہی کا شکار ہو جائیں، بہتر ہے کہ سامان اور بال بچوں کو دریا پار اپنی جاگیر میں پہنچا دیں۔"

احمد خاں نے کہا "اس وقت سرکار کے بدخواہوں کی کثرت ہے۔ یہ لوگ طرح طرح سے ہمارے آقا کو ہماری طرف سے بدگمان کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے اپنے سامان کو دریا کے پار بھیج دیا تو مخالفوں کو ہمارے خلاف کہنے سننے کا اور موقع مل جائے گا۔ نمک حلالی کا تقاضا یہی ہے کہ خاموشی سے اپنی بربادی کا تماشا دیکھا کریں، اور زبان سے اُف تک نہ کریں۔"

اس پر غلام محمد خاں راضی برضا ہو کر رہ گیا!

---

(۵)

انہی ایام میں نواب صاحب پر جیونہ نامی کلاونت کا جادو چل رہا تھا کیونکہ یہ شخص فنِ موسیقی کا ماہر تھا اور شکل وصورت بھی اچھی رکھتا تھا اِس لئے سرکار بہاول پور کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ ایک موقع پر سرکار نے خوش ہو کر فرمایا:۔

"مانگ کیا مانگتا ہے؟"

کہا:۔ "فوج کے کسی دستے کا افسر بنا دیجئے!"

اُسی وقت وزیر کے نام حکم آیا کہ جیونہ کو فوج کا افسر بنا دیا جائے۔ دانا وزیر نے خیال کیا کہ اگر اس کلاونت کو سادات، قریش اور بلوچوں پر افسر مقرر کرتا ہوں تو غدر برپا ہو جائے گا۔ اگر انکار کرتا ہوں تو سرکار کو خدا معلوم کیا کیا بھڑکایا جائے گا۔ اِس لئے حکم نامہ کو سر آنکھوں سے لگا کر جیب میں ڈال لیا۔ کہا:۔

"میاں جیونہ! دس بارہ دن ٹھہرو، آپ کا کام ہو جائے گا!"

اُس کم ظرف سے صبر نہ ہو سکا دوسرے دن پھر آدھمکا۔ وزیر صاحب نے بڑے حوصلے سے پھر وہی جواب دیا۔ اُس نے کہا:۔

"دس بارہ دنوں کی تاخیر کیا معنی رکھتی ہے۔ سرکارِ عالی کے حکم کی فوراً تعمیل ہونی چاہیے!"

فرمایا :- "جیونہ ! ملک داری کا کام بہت مشکل ہے۔ تم جانتے ہو کہ فوج میں سیّد، قریشی اور پٹھان سپاہی ملازم ہیں۔ وہ تمہاری ماتحتی میں لڑنا مرنا کبھی گوارا نہیں کریں گے۔ میں مراسیوں کی ایک فوج بنا رہا ہوں۔ جب وہ تیار ہو جائے گی تمہیں اس کا افسر بنا دوں گا !"

جیونہ غضب ناک ہو کر چلا گیا اور سرکارِ عالی سے جا کر کہا کہ :-

"سلطنت آپ کی ہے یا احمد خاں کی ؟"

اور ساتھ ہی وہ پروانہ، جو وزیر صاحب سے واپس حاصل کر لیا تھا، سرکار کے آگے پھینک دیا۔

اسی طرح آغا اقبال نامی ایک مخنث نے بھی سرکارِ عالی سے فوج کے ایک دستے پر افسری کا پروانہ حاصل کر لیا، مگر وزیرِ اعظم نے جیونہ کی طرح اسے بھی ناکام پھیرا۔ یہ شخص شاہ شجاع کے ہمراہیوں میں سے تھا۔ سرکار کو اس کی خاطر مطلوب تھی۔ ان دونوں واقعات کا سرکار کے دل پر بہت اثر پڑا اور کدورت روز بروز بڑھتی گئی۔ ایک دن نواب صاحب نے حیات محمد خاں دربان کے ذریعے وزیر صاحب کی خدمت میں دو تین کام کہلا بھیجے۔ احمد خاں نے ان میں سے ایک کام بھی نہ کیا۔ دربان نے واپس جا کر ایسی ایسی نا ملائم باتیں وزیر کی طرف سے گھڑ کر سنائیں کہ نواب صاحب کا پیمانہ غضب لبریز ہو گیا !

(۶)

اِن دنوں گڈروالہ کے نواح میں شورش پسند امرا جمع ہو رہے تھے۔ وزیر اعظم کو رپورٹ پہنچی تو اس نے اپنے شیر دل بھائی غلام محمد خاں کو فوج کے ایک دستہ کے ساتھ اُس طرف روانہ کر دیا تاکہ ان کی نقل و حرکت پر کڑی نگرانی رکھے۔ خان مذکور پندرہ بیس دن گڈروالہ میں خیمہ زن رہا۔ اس سے فتنہ پرداز امراء مرعوب ہو کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ اسی اثنا میں کسی نے آ کر اطلاع دی کہ چھنیلی کے جنگل میں کہیں سے شیر آ گیا ہے اور اس نے مضافات کے کئی آدمی اور جانور مار ڈالے ہیں۔ دُوسرے دن خان کے والد کی برسی تھی اور اس کا احمد پور میں پہنچنا نہایت ضروری تھا۔ مگر اس کی حمیّت نے گوارا نہ کیا کہ اس طرح خلقِ خدا کا خُون ہوتے دیکھے اور چشم پوشی کر کے چلا جائے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج رات کو شیر کا خاتمہ کر کے صبح سویرے نماز اپنے بھائی کے ساتھ جا کر ادا کرے گا۔

یہ عزم اس کے لئے کوئی نیا نہ تھا۔ اس کی زندگی میں ایسے ہزاروں واقعات گزر چکے تھے۔ چنانچہ اس نے فوج اور سامان کو تو احمد پور کی طرف روانہ کر دیا اور خود شکاری لباس زیب تن کر کے اپنے جاں نثار ملازم بہادر دما کے ہمراہ چھنیلی کو روانہ ہو گیا۔

(۷)

۲۴ مئی ۱۸۶۱ء کی رات بھی کتنی بھیانک تھی۔ چاروں طرف اندھیرے کا بے پناہ سیلاب ایک خوفناک سی وحشت پیدا کر رہا تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں اور بادِ مخالف کے جھونکے سہتے دونوں سوار ہوا میں اُڑے جا رہے تھے۔ گوٹھ چنی کے آگے راستہ خراب تھا گھوڑے بھٹک بھٹک کر ریت میں کھُبنے لگے۔ اگرچہ دونوں شکاری آبادی سے بچ بچ کر چل رہے تھے مگر پھر بھی کہیں کہیں کُتّوں سے سامنا ہو جاتا تھا کوئی آدھی رات کا عمل ہو گا کہ خان نے گھوڑے کو روکا اور کہا :-

" بہادر! ہم منزلِ مقصود پر آگئے۔ یہاں سے گھوڑوں کو لے کر آہستہ آہستہ چلنا ہو گا۔ بندوق سنبھال کر رکھو۔ ہم شیر کے مارنے کے لئے آئے ہیں۔ رات کی تاریکی میں اس کی آنکھوں پر ہی نشانہ کیا جا سکتا ہے مگر یہ یاد رکھو، بندوق تمہیں اپنی حفاظت کے لئے دی گئی ہے، شیر پر فائر کرنے کے لئے نہیں!"

(۸)

تھوڑی دُور چلے تھے کہ شیر کے گرجنے کی آواز آئی۔ خان جست لگا کر گھوڑے سے کُود پڑا۔ اور بولا :-

" دیکھو بہادر! جنگل کا بادشاہ نئے گوشت کی بُو پا کر دھاڑ رہا ہے

تم گھوڑوں کو تھامو۔ میں اپنے شکار کا استقبال کرتا ہوں۔ خان بندوق ہاتھ میں لے، آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔ شیر گرجتا دھاڑتا چلا آ رہا تھا۔ اس کی روشن آنکھیں مہیب انداز میں صاف طور پر چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ خان نے نشانہ باندھ کر لبلبی کو دبایا۔ جنگل کی فضا گونج اُٹھی۔ شیر گرج کر لپکا۔ مگر نشانہ اتنا کاری پڑا تھا کہ آتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ چند لمحات تک مُنہ سے صدائے ضعیف نکالتا اور درد وکرب سے ہاتھ پاؤں مارتا رہا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ جنگل کے ماحول میں ہولناک کپکپاہٹ سی پیدا ہوئی اور جنگلی پرندے خوف سے پھڑ پھڑانے لگے۔ اب بہادر ابھی قریب آ چکا تھا۔ اُس نے آگ جلائی۔ خان نے روشنی میں شیر کے بھاری بھرکم لاشے کو دیکھ کر کہا

"چھوڑو بیٹا! اِسے اُٹھانے کی کوشش نہ کرو!"

دونوں واپس لوٹے۔ گھوڑے خوف کے مارے پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ خان نے تھپکی دی اور پیار سے چمکارا۔ گھوڑا ہنہنایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا مالک کے اس کارنامے پر مبارکباد دے رہا ہے۔ خان اُچک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ۳۶ میلوں کی مسافت کاٹ، ابھی محلے کی مسجد میں اذان بھی نہ ہوئی تھی کہ گھر جا پہنچا۔

---

(۹)

صبح سویرے محمد یار خاں کی زبانی یہ سُن کر غلام محمد خاں دم بخود رہ گیا کہ حسین شبیر کا یہ خاتمہ کر کے آیا ہے، اس کے شکار کا پروگرام بن چکا تھا، اور آج علی الصبح سرکارِ عالی نے چہار اسپہ فٹن پر تشریف لے جانا ہے۔ غلام محمد خاں بے تحاشہ گھوڑے پر سوار ہو کر ڈیرہ مبارک پہنچا۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہُوا کہ سرکار یہاں سے کوئی دو گھنٹہ رات رہے کے روانہ ہو چکی ہے۔ خان کے پاؤں من من کے ہو گئے۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بھائی کے پاس جا کر ساری کیفیت من وعن بیان کر دی۔

وزیر اعظم نے کہا "بہت بُرا ہُوا، مگر اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے اگر اس پر بھی گرفت ہونی ہے تو یہ امرِ الٰہی ہے۔ اس سے مفر کا کوئی چارہ نہیں۔ جاؤ گھر میں بیٹھ کر خداوندِ عالم سے اپنی اور اپنے خاندان کے لئے بہتری کی دُعا مانگو، میں بھی مصروفِ دُعا ہوتا ہوں۔"

(۱۰)

دُوسرے دن ۲۵ مئی کے سات بجے بہرام خاں کوتوال نے سرکارِ عالی کا یہ فرمان آکر پیش کیا۔ "احمد خاں وزیر اعظم بہاول پور! بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر آپ کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ہے۔ مناسب ہے کہ آپ عیال واطفال کو ہمراہ لے کر ۲۴ گھنٹوں کے اندر ریاست سے باہر چلے جائیں!"

بوڑھے وزیر نے بڑے حوصلے سے پروانہ کو ملاحظہ کیا اور کہا:۔

"مالک کی رضا پر نوکر راضی ہے۔ اگر باربرداری کا انتظام ہوجائے تو غلام ابھی اس سرزمین کو الوداع کہنے کے لئے تیار ہے۔ کوتوال یہ جواب لے کر محلسرائے سلطانی کو روانہ ہوا۔ اور وزیر پروانۂ شاہی کو ہاتھ میں لیکر اٹھا تاکہ کسی ملازم کو بھائیوں کے پاس روانہ کرے۔ مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ محل کے چاروں طرف پولیس نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ ملازم غائب تھے۔ صرف خیرو کہار زنانخانے کی ڈیوڑھی پر بیٹھا نظر پڑا۔ اُسے اشارے سے بُلا کر کہا:۔

"سرکار نے ہمیں نوکری سے ہٹا دیا ہے۔ ۲۴ گھنٹوں کے اندر ریاست سے نکل جانے کا حکم ہے۔ فوراً احمد پور جاکر میرے بھائیوں کو اطلاع کرو!"

(۱۱)

غلام محمد خاں اپنے افراد کے ساتھ بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ خیرو آتا ہوا آیا اور چیخ کر قدموں میں گر گیا۔ غلام محمد خاں نے ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا:۔

"خیرو! خیر تو ہے؟"

"کوئی خیر نہیں ہے میرے آقا! غضب ہو گیا۔ وزیر صاحب نوکری سے

ہٹا دیئے گئے۔ محل پر شاہی پہرہ ہے کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں۔ میں زنانخانے کی ڈیوڑھی پر دم بخود یہ تماشا دیکھتا تھا کہ وزیر صاحب نے بُلا کر کہا۔ کھڑے کیا دیکھتے ہو دوڑ کر میرے بھائیوں کو اطلاع کرو!"

غلام محمد خاں کا چہرہ یہ خبر سُن کر سُرخ ہو گیا۔ آنکھوں کی پُتلیاں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ چلّا کر کہا۔

• کیا ذلیل ہو کر ہم اس ملک سے نکلیں، آخر کیوں؛ محض اس وجہ سے کہ ایک شیر کیوں مار ڈالا۔ کیا ہماری ۲۰ سالہ خدمات پر پانی پھیر دیا گیا؟" محمد یار خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "بھائی! برادری کے تمام نبرد آزما اور بہادر جوانوں کو بُلا لو۔ اگر سرکار ہمارے خون سے اس سرزمین کو لالہ زار بنانا چاہتی ہے تو بسم اللہ، جس شخص کو خدا نے سربلند پیدا کیا ہے' وہ کسی حالت میں سرنگوں نہیں ہو سکتا۔ جان جائے گی مگر آن نہیں؂

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی

دونوں بھائی مرنے مارنے پر کمر بستہ ہو گئے۔ اندر حرم سرا میں پہلے سے خادمہ حمد قوی نے اطلاع کر دی تھی۔ سہمی ہوئی غم انگیز شکلیں اور حسرت و یاس میں اُلجھے ہوئے چند چہرے اپنے مردوں کے انتظار میں چشم براہ بیٹھے تھے۔ سب کو جمع کر کے کہا:-

" امرِ واقعہ تم پر مخفی نہیں رہا۔ موت کا پیالہ ہر شخص نے پینا ہے خواہ آج خواہ کل۔ ہماری موت کا وقت قریب آپہنچا۔ ہمارا واپس آنا محال ہے۔ ممکن ہے کہ تم ہمیں پھر نہ دیکھ سکو۔ اِس لئے تم سب کو افغانی غیرت کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ اگر تم دیکھو کہ عزّت بچتی نظر نہیں آتی تو تلواریں گھر میں پڑی ہیں۔ ان سے ایک دُوسرے کا خاتمہ کر دینا۔"

سب نے رو کر کہا:۔

" اگر یہی صورتِ حال ہے تو پھر پہلے ہمارا کام تمام کرو، پھر ڈیرہ میلارک کو جاؤ ــــ!" ــــ مگر خان نے کہا:۔

" یہ نہیں ہو سکتا۔ خودکشی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ جس طرح کربلا کے میدان میں امام مظلوم کی مستورات نے صبر کیا تھا۔ تم بھی اسی طرح سختیاں سہو، مگر عزّت پر آنچ نہ آنے دو!"

یہ کہہ کر دونوں بھائیوں نے غسل کر کے کپڑے بدلے، عطر لگایا اور تلوار بندوق سے لیس ہو کر باہر نکل آئے۔ خاندان کے اعزّہ و اقارب بھی حقِ نمک ادا کرنے کو جمع تھے۔ غلام محمد خاں نے کہا:۔

" ہم تو مرنے جا رہے ہیں، تم کیوں جان گنواتے ہو ؎

اے ہم نفساں آتشم از من بگریزید
ہر کس کہ شود ہمرہِ من دشمنِ خویش است"

تاج محمد خاں نے کہا:۔

"عمر بھر آپ لوگوں کے سائے میں پرورش پائی ہے۔ آپ کے بعد ہمارا جینا نہ جینا برابر ہے۔ جدھر تم جاؤ گے ہمیں بھی ساتھ پاؤ گے!"

محمد زمان خاں سیات اللہ خاں، سردار خاں، غلام قادر خاں، صالح محمد خاں بادوزئی، محمد نواز خاں، محمد خاں، سمند خاں قصوریہ، نواز خاں سید پیر شاہ، سید مہر شاہ، ہوت بلوچ، غلام علی خاں، حفیظ اللہ خاں وغیرہ بھی فوجی لباس پہن کر، بندوق کندھے پر رکھ ساتھ ہوئے۔

(۱۲)

سرکار نے ملّا ابراہیم کوتوال کو وزیر کے محل کی نگرانی کے لیے مقرر کیا اور عبدالکریم خاں وجمعیت رائے دفتر مستوفی کے نام حکم بھیجا کہ قلعہ میں حاضر ہو کر حساب کتاب کی فہمید کریں۔

عبدالکریم خاں وزیر اعظم کا معتمد تھا۔ نواب صادق محمد خاں ثالث کو رپورٹ پہنچی تھی کہ یہ شخص سرکار پر جادو کرتا ہے۔ سرکار نے اس کے سامنے کے دو دانت توڑ دیئے۔ اور مچھلی و سیاہ تیل پلایا تاکہ اس کا جادو کارگر نہ ہو۔ سرکار سے طلبی کا فرمان پہنچا تو اس نے کہا کہ مجھے سرکارِ عالی کے حضور میں جانے سے انکار نہیں۔ مگر پہلے خداوند نعمت سے مل لینے دو اُنہوں نے اپنی طرف کھینچا۔ عبدالکریم خاں نے اپنا دامن چھڑانے

کی کوشش کی۔ اسی دار وگیر میں اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ یہ غصہ میں جھلّا اُٹھا اور سپاہی کو تھپّڑ مار دیا۔ انہوں نے سنگینوں پر دھر لیا، چنانچہ شاہی محل تک جاتے جاتے ملکِ عدم کو رخصت ہو گیا۔

(۱۳)

غلام محمد خاں اور اس کے جاں نثار رفقاء گھوڑوں پر سوار ہو کر بڑی تمکنت اور وقار کے ساتھ سر سے پاؤں تک اودھی بنے آ رہے تھے عربی گھوڑے رقص کرتے اور ہنہناتے چلے آتے تھے۔ جب قلعہ معلیٰ کے قریب پہنچے، عبدالکریم خاں کی لاش نظر آئی بے ساختہ چلّا کر کہا:۔

"محمد یار خاں! دیکھتے ہو؟ پہل سرکار کی طرف سے ہوئی ہے!"

سامنے ملّا ابراہیم کوتوال، مخدوم راجن بخش گویا انتظار میں کھڑے تھے۔ دیکھ کر آگے بڑھے اور کہا:۔

"وزیر صاحب محل میں نظر بند ہیں۔ سرکار کی اجازت کے بغیر آپ اُن سے نہیں مل سکتے!"

"کیا ہم بھائی سے ملنے کے لئے بھی اجازت حاصل کریں!"

غلام محمد خاں نے حیران ہو کر بھائی کے مُنہ کی طرف دیکھا۔ محمد یار خاں نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ دونوں نے یکبارگی گھوڑوں کو جو ایڑ لگائی۔ اُن کی زد سے نکل گئے۔ ملّا ابراہیم نے ایسا فائر کیا کہ ملازم زخمی

ہو کر گر پڑا۔ پیچھے جو جاں نثار آ رہے تھے، انہوں نے یک وقت باڑھ لگائی۔ مُلّا ابراہیم مر گیا اور مخدوم حسن بخش بُری طرح زخمی ہوا۔ اس طرح خان کے آدمیوں نے خون کا بدلہ خون سے لے لیا۔

وزیرِ اعظم کے دروازے پر پہنچے تو وہاں سرکار کا خاص ملازم کریم بخش رائفل ہاتھ میں لئے پہرے پر موجود تھا۔ اُس نے اندر داخل ہونے سے روکا۔ جس پر خان کے جاں باز بہادروں نے اُسے بھی بندوق سے ختم کر ڈالا۔ اندر داخل ہو کر دیکھا کہ ۷۰ برس کا بوڑھا وزیر تخت پر مصلّٰی بچھائے قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف ہے۔ بھائی کو زندہ دیکھ کر خان نے خدا کا شکر ادا کیا۔ احمد خاں نے قرآن مجید کو بند کرتے ہوئے سب صاحبان کو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ غلام محمد خاں نے راستے کے حادثات کا ذکر کیا، فرمایا۔ مالک کے مقابل ہونا ہم جیسے مخلص غلاموں کو مناسب نہیں۔ ہم انتہائی نیاز مندی سے قرآن مجید کو سفارشی بنا کر بھیجیں گے، سرکار ضرور معاف کر دے گی۔ غلام محمد خاں نے جوش میں آ کر کہا۔ بھائی صاحب! اب ایسی توقعات کو رہنے دیجئے۔ ہم حرام موت مرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں۔ لڑیں گے اور مردانہ وار لڑیں گے تاکہ جب مؤرخ بہاول پور کی تاریخ لکھنے بیٹھے تو ہماری بہادری کے کارناموں کو آبِ زر سے لکھے۔

(۱۴)

نواب صاحب بھی محل میں بیٹھے پل پل کی خبریں منگوا رہے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ پٹھان غدر پر آمادہ ہیں تو فوج کا ایک دستہ ان کی گرفتاری پر تعینات کیا اور توپچی کو حکم ہوا کہ ان پر گولہ باری کرے۔ مگر پٹھانوں کی محبوبیت ایک دنیا پر ظاہر تھی۔ ہر ایک ڈرتا تھا۔ سرکار کے پیارے وزیر ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں جب غصّہ فرو ہو جائے۔ سرکار ہم سے باز پُرس کرے کہ ایسے بہادروں کو تم نے کیوں قتل کیا۔ اِس لئے توپ میں بجائے گولہ اور بارود کے رائی اور بان ڈال کر چلاتے رہے۔

سرکار بہاول پور نے نھتے نامی توپچی کو قید سے رہا کر کے طلب کیا اور اپنے دست خاص سے اس کے گلے میں کنٹھا اور ہاتھوں میں سونے کے کنگن ڈالے۔ وہ بڑے فخر اور غرور سے دمدمے پر آیا۔ پہلے خالی توپ چلائی۔ غلام محمد خاں نے مہتابی کی شعاع پر ہی ایسا نشانہ باندھ کر فیر کیا کہ نھتا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

سرکار کو اطلاع پہنچی تو اس نے بڑا افسوس کیا۔ رات بھر بمباری ہوتی رہی، مگر کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ صبح کو نواب صاحب خود گھوڑے پر سوار ہوئے اور فوج کی ہمّت بندھانے کے لئے موقعہ

پر تشریف لے آئے۔ طرفین سے خوب مقابلہ ہوا۔ احمد خاں آم کے تنے کی اوٹ میں فائر کر رہا تھا۔ سرکار کو مقابل دیکھ کر کہا۔
ہٹ جایئے گولی آتی ہے۔ سر کے کچھ بال اُڑ جائیں گے مگر آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ ساتھ ہی سن سے گولی پرواز کرتی ہوئی سرکار کے بالوں کی ایک لٹ اڑا کر نکل گئی۔

احمد خاں پھر بولا ——— "سرکار! ہمیں اپنے دشمنوں کے لئے زندہ رہنے دیجئے، مگر کچھ جواب نہ ملا۔ اس پر احمد خاں نے مایوس ہو کر اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ پڑھا۔ آخر پہر تک خونیں کارزار گرم رہا۔ سردار احمد خاں کے جاں نثار ایک ایک کر کے مارے گئے۔ خود سردار صاحب قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے دو دستی تلوار چلا رہے تھے، اچانک ایک گولی ایسی آئی کہ سر سے پار نکل گئی۔ بوڑھے وزیر نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور گر کر جاں بحق ہو گیا۔ غلام محمد خاں اس طرح جھپٹ کر پہنچا۔ جیسے باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ بھائی کی لاش کو اٹھا کر اندر لے گیا اور چوبیں تخت پر لٹا کر اپنے کمسن بھتیجے محمد ناصر کو آواز دی۔ آؤ بیٹا اپنے باپ کی لاش کا خیال کرو۔ گھبراؤ نہیں، ہم بھی ابھی آئے۔ مستورات نے بڑا حوصلہ دکھایا کہ کوئی نہ چیخی نہ چلائی۔ بڑی بیگم نے بڑے دل گردے سے لاش کو کپڑے سے ڈھک

دیا اور محمد ناصر کو پیار سے راضی برضا ہونے کی تعلیم دینے لگی۔ غلام محمد خاں ابھی باہر نکلا ہی تھا کہ محمد یار خاں کی چیخ سُنائی دی۔ اُس کے سینے میں گولی اُتر چکی تھی۔ وہ گھوڑے سے گرا چاہتا تھا کہ غلام محمد خاں نے لپک کر پکڑ لیا۔ نیم جاں لاش کو سینے سے چمٹائے اندر لے گیا۔ اور وزیر اعظم کے دوش بدوش سُلا دیا۔ اور پھر خود ننگی تلوار لے کر گھوڑے پر سوار ہوا اور دُشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سرکارِ عالی کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت غلام محمد خاں کا سر مسلسل ضربات سے پھٹ چکا تھا۔ بدن کے کپڑے خون سے لت پت ہو چکے تھے۔ نواب صاحب کو پکار کر کہا:۔

"حضورِ والا! کب تک عذاب دو گے۔ اپنے ہاتھ سے ایک فائر کیوں نہیں کر دیتے کہ بندہ اس مخمصے سے نجات پائے۔"

نواب صاحب پٹھانوں کی جوانمردی اور بے باکی پر اتنے حیران کھڑے تھے کہ ان کا دل ایسے بہادروں کو ختم کرنے کے لئے آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ اس وقت پٹھانوں کے تمام جوان کٹ چکے تھے۔ آخری سورما بھی چند لمحوں کا مہمان نظر آتا تھا۔ نواب صاحب نے ہاتھ کھڑا کیا کہ لڑائی موقوف کرو، اور غلام محمد خاں کو زندہ میرے پاس لے آؤ مگر وہ شیر اس طرح ہاتھ آنے والا کب تھا۔ مقابلے کے لئے للکارتا

اور شیر کی طرح ڈکارتا رہا۔ لیکن چونکہ خون کافی مقدار میں نکل چکا تھا۔ اس لئے چکرا کر گھوڑے سے گر پڑا ــــ نواب صاحب دوڑ کر قریب پہنچے مگر اُس جاں باز کا دَم نکل چکا تھا۔

یہ تینوں شیر دل بھائی ڈیرہ نواب صاحب کے قریب ایک ہی قبر میں محوِ خواب ہیں۔ ان کا مقبرہ احمد خاں شہید کے نام سے خاص و عام میں امتیازی شہرت رکھتا ہے۔ وہ کبھی کے ختم ہو چکے لیکن ان کا نام اُن کے بہادرانہ کارناموں کی وجہ سے ہنوز زندہ ہے اور زندہ رہے گا

؎ بنا کردند خوش رسمے بخاک و خُون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

○

طابع محمد جمالی خوشنویس ملتان

مولانا نور احمد خان فریدی کی دیگر تصانیف

۱۔ تذکرہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریّا ملتانی قدس سرہٗ

(منظور شدہ وزارتِ تعلیمات مغربی پاکستان)

اُنہوں نے جس طرف بھی نگاہ اُٹھائی خزاں نے مُنہ چھپا لیا اور بہاریں کھلکھلا کر نمودار ہو گئیں۔ اندھیرے بھاگ گئے اور اُجالے کا نُور ہر طرف بکھر گیا۔ نامرادوں نے مرادوں سے دامن بھر لیے اُس نائب رسُول کی داستانِ حیات جس کے خلفاء نے جاوا سے پاک و ہند تک اسلام کی شمعیں روشن کر دیں!

قیمت۔ قسمِ اوّل۔ مجلد بارہ روپے، بے جلد دس روپے

قسمِ دوم۔ چھ روپے

۲۔ تذکرہ شیخ الاسلام صدر الدّین عارف ملتانی قدس سرہٗ

(منظور شدہ وزارتِ تعلیمات مغربی پاکستان)

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمۃ کا نامور فرزند اور دُنیائے تصوف کا وہ شہریار جس نے آباؤ اجداد کا تمام ترکہ ایک ہی دن میں خدا

کی راہ میں لٹا دیا —— وہ مجاہدِ کبیر، جس کے فقر نے شوکتِ شاہی پر فتح پائی۔ وہ عارفِ دوراں، جس کے فیضِ صحبت نے شیخ جمال خنداں روؒ شیخ حسام الدینؒ، شیخ علاء الدینؒ، شیخ صلاح الدینؒ اور قطب الاقطاب شاہ رُکنِ عالمؒ جیسے شہبازِ طریقت دُنیا کے سامنے پیش کئے

قیمت مجلد بارہ روپے، بے جلد دس روپے

۳۔ تذکرہ قطب الاقطاب شاہ رُکنِ عالم ملتانی قدس سرہٗ

(منظور شدہ وزارتِ تعلیمات مغربی پاکستان)

دورِ تغلق کا رجلِ کبیر، جس کے ایک جملہ سے قہرمان شہنشاہ کی خون آشام تلوار نیام میں چلی گئی اور شہر کا قتلِ عام رُک گیا —— وہ جوادِ اعظم، کہ جب دار السلطنت دہلی کی طرف متوجہ ہوتا، دہلی کا سلطان تین منزلیں طے کر کے استقبال کو حاضر ہوتا اور پانچ لاکھ اشرفی بطورِ نذر کے پیش کرتا، مگر یہ تمام رقم اُسی دن شہر کے محتاجوں میں تقسیم کر دی جاتی!

قیمت۔ قسمِ اوّل پندرہ روپے، قسمِ دوم تیرہ روپے

ملنے کا پتہ { قصر الادب، نور محل براہِ شجاع آباد ضلع ملتان / قصر الادب، رائٹرز کالونی، ملتان شہر } پاکستان

بلوچ قوم اور اُس کی تاریخ

(منظور شدہ وزارتِ تعلیمات مغربی پاکستان)

جلد اوّل

دُنیا کی وہ عظیم قوم جو برّ اعظم ایشیا میں دو کروڑ کی تعداد میں پھیلی پڑی ہے ــــ جس کا ماضی حرب وضرب کی خونچکاں داستان کا حامل ہے۔ جس کا عہدِ حاضر اس کے جیالے فرزندوں کی غیر متزلزل استقامت غیر معمولی شجاعت اور جود وسخا کی عکاسی کرتا ہے ــــ جس نے برِ صغیر پاکستان و ہند میں عظیم الشان شہروں کی بنا ڈالی۔

اُس بہادر قوم کی تاریخ، جس کے جیالے جوانوں نے ۱۹۴۷ء میں مردھڑ کی بازی لگا کر لاکھوں مہاجرین کو بھارت کے بدمعاشوں اور غنڈوں سے نجات دلائی ــــ اور ــــ جس کے بہادر فرزند ۱۹۶۵ء میں بھارت کے لاتعداد ٹینکوں کے سامنے سدِّ سکندری بن گئے!

قیمت۔ قسمِ اول پندرہ روپے، قسمِ دوم دس روپے

ملنے کا پتہ: قصر الادب، نور محل براہِ شجاع آباد ضلع ملتان
قصر الادب، رائیٹرز کالونی ملتان شہر — پاکستان

اسلامی افسانے ـــــــ جلد اوّل

مصنف ـــــــ مولانا نور احمد خاں فریدی

ایڈیشن ششم ـــــــ تعداد، ۲ ہزار

صفحات ـــــــ 288

ناشر ـــــــ عمر علی خاں بلوچ

طابع ـــــــ حاجی منظور احمد احقر

مطبع ـــــــ ہمدرد پرنٹنگ پریس ملتان

قیمت ـــ قسمِ اوّل پانچ روپے، قسمِ دوم چار روپے

ـــــ مقاماتِ اشاعت ـــــ

۱۔ قصر الادب، نور محل براہِ شجاع آباد، ضلع ملتان

۲۔ قصر الادب، رائٹرز کالونی، ملتان شہر

سرزمین ملتان

ملتانِ ما بجنتِ اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ می کنند

سرزمینِ ملتان کو تاریخِ پاک و ہند میں جو امتیازی درجہ حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اِس گرانقدر تصنیف میں عروس البلاد ملتان کی تاریخی حیثیت واضح کرنے کے علاوہ ان اولیائے کرام و صوفیائے عظام کی سچّی اور دلگداز داستانیں تفصیل سے پیش کی گئی ہیں، جو حیاتِ سرمدی کی چادر تانے اِس شہر میں محوِ خواب ہیں۔

از مولانا نور احمد خاں فریدی

مجلد دو روپے آٹھ آنے — بے جلد دو روپے

ناشر منیجر قصر الادب، جگو والہ، براہ لودھراں، ضلع ملتان